# قربِ الٰہی کے دو مراتب

اور

# ہماری دینی وملّی ذمّہ داریاں

## قرآن وسُنّت کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

بانیٔ تنظیم اسلامی

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون:3-35869501

www.tanzeem.org

# پیش لفظ

الحمد للّٰہ وکفٰی والصلٰوۃ والسّلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

قرآن مجید، فرقانِ حمید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ پوری نوعِ انسانی کے لیے تاقیامِ قیامت کتابِ ہدایت ہے۔ خود باری تعالیٰ نے اس کتابِ عزیز کے متعدد اوصاف مختلف اسالیب سے بیان فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا ایک وصف تصریفِ آیات ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہ مضمون بایں الفاظ مبارکہ بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا ؕ﴾ (آیت ۴۱) اور یہی مضمون سورۃ الکہف میں ان الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوا کہ ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ﴾ (آیت ۵۴) گویا ع ''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' اور ''آ فتاب آمد دلیل آفتاب'' کے مصداق اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مبین میں صراطِ مستقیم کو مختلف اسالیب سے واضح و مبرہن فرما دیا اور اس طرح پوری نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت فرما دی کہ اس میں کوئی ابہام نہیں رہا۔ پھر اسی اتمامِ حجت کو مؤکد کرنے کے لیے اپنی خاص رحمت کے طفیل انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے، جن میں خاتم النبیین سید المرسلین جناب محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات بھی شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جملہ رسولوں کی بعثت کی غایت بیان فرمائی: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ﴾ (النساء:۱۶۵) اور نبی آخر الزمان، سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ ۢ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا ﴿۴۱﴾﴾ (النساء)۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قولی و عملی شہادت، اپنے ارشادات و فرمودات، اپنی سنت اور اُسوۂ حسنہ سے قرآن حکیم کی ہدایات کی تبیین فرما دی اور عدل و قسط پر مبنی ایک کامل نظامِ حیات بھی قائم کر کے نوعِ

انسانی پر آخری درجہ میں کامل اتمامِ حجت فرما دیا۔ چنانچہ قرآن وحدیث اور کتاب وسنت مل کر نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے ایک وحدت بنتی ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظامِ زندگی اور خلافتِ راشدہ کے دورِ سعید کو پوری نوعِ انسانی کے لیے حجتِ کاملہ کا مقام حاصل ہے۔

قرآن مجید کی عظمت وفضیلت کے متعلق امام ترمذی اور امام دارمی رحمہما اللہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں قرآن مجید' فرقانِ حمید کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے یہ بات بھی فرمائی ہے کہ ((فِیْہِ نَبَأُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ)) ''اس (کتاب اللہ) میں تم سے پہلی اُمتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں اور تمہارے بعد (وقوع پذیر ہونے والے حالات) کی اطلاعات بھی ہیں (یعنی اعمال و اخلاق کے جو دنیوی واخروی نتائج وثمرات مستقبل میں سامنے آنے والے ہیں' قرآن مجید میں ان سب سے بھی آگاہی دے دی گئی ہے) اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں' قرآن میں ان کا حکم اور فیصلہ بھی موجود ہے''۔ لہٰذا ہر دور کے حالات وواقعات اور مسائل کے حل کے لیے قرآن حکیم' سنتِ مطہرہ' اُسوۂ حسنہ اور فرموداتِ نبویؐ میں اُمت مسلمہ کے لیے کامل ہدایات ورہنمائی موجود ہے۔ البتہ ایمان وایقان کے ساتھ کتاب وسنت میں غور وفکر اور تدبر کی ضرورت ہے۔ عالمِ اسلام میں اُمت مسلمہ دینی' اخلاقی اور دنیوی اعتبارات سے جس نکبت' مسکنت' زوال' انحطاط' گھمبیر اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہے ان کے متعدد اسباب میں تین کو اوّلیت واہمیت حاصل ہے۔ ایک ہے مسلمانوں کے تعلق مع اللہ میں ضعف' ایک ہے الہدیٰ یعنی قرآن حکیم سے بُعد اور ایک ہے اتباعِ سنت سے اغراض واغماض۔ الا ماشاء اللہ۔

اُمت مسلمہ کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ ایسے رجالِ دین کو اٹھاتا رہا ہے جنہوں نے مسلمانوں کو ان تینوں اساسی امور کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی ہے۔ بحمد اللہ ہمارے اس دور میں بھی ایسے رجالِ دین اٹھتے رہے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایک عاجز بندہ ڈاکٹر اسرار احمد بھی ان لوگوں میں شامل ہے جس نے اپنی عمر عزیز اسی کام کے لیے وقف کر دی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق' تائید اور نصرت کے بھروسے پر اُمت مسلمہ پاکستان کو ان امور کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اور اقامت دین یا عام فہم اصطلاح میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے مقصد کے لیے انہوں نے ایک تحریک بھی ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے قائم کی ہے۔

تنظیم اسلامی کے چھٹے سالانہ اجتماع کے افتتاحی خطاب منعقدہ یکم مئی ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پاکستان کو درپیش پیچیدہ اور پرخطر حالات پر کتاب وسنت کے حوالوں سے گفتگو بھی کی اور ان کا حل پیش بھی فرمایا۔ مزید برآں تقرب الی اللہ کے مراتب کے موضوع پر مفصل اظہار خیال کیا اور اس کی روشنی میں عالمِ اسلام بالخصوص پاکستان کے پر پیچ مسائل کا حل تجویز کیا۔ اس خطاب کے ذریعے سے ان شاء اللہ العزیز ''تنظیم اسلامی'' کی اساسی دعوت اور اس کا طریق کار بھی ایک نئے اسلوب اور انداز سے قارئین کرام کے سامنے آجائے گا۔

اس خطاب کے لیے محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ نے حسب ذیل موضوعات مقرر کیے تھے:

- **از روئے قرآن حکیم:**

ہمارے بنیادی دینی فرائض کیا ہیں؟
اور آیا ان کی ادائیگی انفرادی طور پر ممکن ہے؟

- **سنت رسولؐ کا مقام کیا ہے؟**

اور موجودہ دور میں اتباعِ رسول اور احیاءِ سنت کے تقاضے کیا ہیں؟

- **طریقت اور سلوک کی حقیقت کیا ہے؟**

اور تقرب الی اللہ کے ذرائع ووسائل کون سے ہیں؟

- **مزید برآں یہ کہ**

ملک وملت کے بقاء واستحکام کے ضمن میں ہم اپنی ذمہ داریاں کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟

خطاب میں موضوعات پر گفتگو کی ترتیب البتہ بدل گئی ہے' لیکن جملہ امور کا احاطہ ہو گیا ہے۔ ان سطور کے عاجز راقم کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے متعدد دروس وخطاب ٹیپ کے فیتے سے صفحاتِ قرطاس پر منتقل کرنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق کی ارزانی ہوئی ہے' جن میں سے بعض کتابی شکل میں مطبوعہ موجود ہیں۔ تحدیثِ نعمت اور اظہارِ واقعہ کے طور پر عرض ہے کہ اس خطاب کی منتقلی کے لیے اس عاجز نے اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی حتی الوسع سعی کی تھی۔ **الحمد للہ والمنّۃ** یہ خطاب اوّلاً ''تنظیم اسلامی'' کے چھٹے سالانہ اجتماع کی روداد میں شائع ہو چکا ہے۔ اب اسے علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اس کے افادے کا حلقہ وسیع تر ہو سکے۔

اس احقر کی کوشش تھی کہ محترم ڈاکٹر صاحب اس پر نظر ثانی فرما لیتے۔ لیکن ارادے کے باوجود اپنی بے انتہا دعوتی و تنظیمی مصروفیات کے باعث وہ اس کام کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ اس کتاب میں جو صواب اور حق ہے وہ منجانب اللہ تعالیٰ ہے اور جو خطا ہے' فروگزاشت ہے' اظہارِ مدعا میں ابہام ہے' اس کی ذمہ داری اس عاجز کے شانوں پر ہے جس کے لیے یہ عاجز صمیم قلب سے بارگاہِ ربّ العزت میں دست بدعا ہے کہ:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔ امین یَارَبَّ العٰلمین!

احقر

**جمیل الرحمٰن** عفی عنہ

## پس نوشت (برموقع طبع پنجم)

اس کتابچے کے قبل ازیں چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اگست ۲۰۰۵ء میں چوتھا ایڈیشن شائع ہوا تو محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے ہدایت فرمائی کہ آئندہ اس خطاب کو مزید ایڈیٹنگ کے ساتھ کمپیوٹر کمپوزنگ پر شائع کیا جائے۔ لہٰذا راقم الحروف نے اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس کی مزید نوک پلک سنوارنے کی کوشش کی اور اس میں بیان کردہ احادیث کی تخریج بھی کر دی۔ نیز بعض ایسے مباحث کو حذف کر دیا جن کا تعلق خاص طور پر ۱۹۸۱ء میں منعقد ہونے والے سالانہ اجتماع سے تھا۔ بعد ازاں اس گراں قدر خطاب کو ماہنامہ میثاق شمارہ اکتوبر و نومبر ۲۰۰۶ء میں شائع کیا گیا۔ اب یہ نظر ثانی شدہ خطاب کتابچے کے طبع پنجم کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

**خالد محمود خضر**

مدیر شعبہ مطبوعات

۱۸ مئی ۲۰۰۹ء

# قربِ الٰہی کے دو مراتب

## اور ہماری دینی ذمہ داریاں

## قرآن و سنت کی روشنی میں

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اعوذ باللّٰہ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجیم۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور دیکھنا تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر اس حال میں کہ تم (اللہ کے) فرماں بردار ہو۔ اور چمٹ جاؤ اللہ کی رسّی کے ساتھ مجموعی طور پر اور باہم تفرقہ میں مت پڑو۔ اور یاد کرو اللہ کی اُس نعمت کو جو تم پر ہوئی، جبکہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم تو آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے تک جا پہنچے تھے مگر اللہ نے تمہیں اس سے بچایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو! اور چاہیے کہ تم سے ایک ایسی

جماعت وجود میں آئے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے ـــــ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔

سورۂ آل عمران کی ان آیات میں ہم مسلمانوں کے لیے ایک لائحہ عمل ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کی ہر آیت میں علمی نکات بھی ہیں، حکمت وفلسفہ کے مسائل بھی ہیں اور عملی رہنمائی بھی ہے، چنانچہ ان میں بھی یقیناً علمی اعتبار سے بڑے وقیع نکات موجود ہیں، لیکن آج میری گفتگو ان کے عملی پہلوؤں کے مختصر بیان تک محدود رہے گی۔ اس لیے کہ علمی نکات پر توجہ کا ارتکاز زیادہ ہو جائے تو اکثر و بیشتر عملی رہنمائی کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

قرآن مجید کی یہ تین آیات اس عملی رہنمائی اور ہدایت کے اعتبار سے جو وہ اہلِ ایمان کے سامنے رکھتا ہے، قرآن حکیم کے جامع ترین مقامات میں سے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ایک مسلمان کے کیا فرائض ہیں اور اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اسے سب سے پہلے کن امور پر اپنی توجہات کو مرتکز کرنا ہوگا، ان کو بڑی جامعیت کے ساتھ پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری آیت کا موضوع یہ ہے کہ ان افراد کو باہم جوڑنے والی چیز، انہیں ایک اُمت بنانے والی شے، انہیں ''حزب اللہ'' بنانے والی چیز، ان کے مابین ذہنی وفکری ہم آہنگی اور عملی اتحاد پیدا کرنے والی چیز کون سی ہے!!ـــــ اور تیسری آیت میں یہ نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ اس اُمت یا حزب اللہ یا اس جماعت کا مقصد کیا ہے! کس کام کے لیے اس کو محنت اور جدّ وجہد کرنی ہے!

ان آیات پر مزید گفتگو سے قبل میں آپ کے سامنے چند احادیث نبویہؐ پیش کررہا ہوں۔

عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْفَجْرِ ثُمَّ وَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، فَقَالَ قَائِلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا، قَالَ :

((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِنْ کَانَ عَبْدًا حَبْشِیًّا، فَاِنَّہٗ مَنْ یَعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرَی اخْتِلَافًا کَثِیْرًا، فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ، عَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ، وَاِیَّاکُمْ وَالْمُحْدَثَاتِ فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ))(۱)

پہلے ہم اس حدیث کا ایک رواں ترجمہ کر لیتے ہیں:

''حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد ہمیں ایسا پُر اثر وعظ فرمایا کہ ہماری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور ہمارے دل اس سے لرز گئے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو ایسے لگتا ہے کہ آپؐ نے کوئی الوداعی وعظ فرمایا ہے (یعنی اس انداز سے جیسے آپؐ ہم سے وداع ہو رہے ہیں یا ہمیں وداع کر رہے ہیں) تو ہمیں نصیحت کیجیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(سب سے پہلے تو) میں تمھیں وصیت کرتا ہوں اللہ کے تقویٰ کی، وہ جو العزیز ہے اور بہت جلالتِ شان والا ہے، اور (دوسری نصیحت ہے) سننے اور ماننے کی (یعنی اجتماعی نظم و ضبط) اگرچہ ایک حبشی غلام تمہارا امیر بنا دیا جائے۔ اس لیے کہ جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تمہارے لیے میری سنت اور ہدایت یافتہ راست رَو خلفاء کی سنت کی پیروی لازم ہے۔ اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ (یہ محاورہ ہے، یعنی کسی چیز کو شدت اور مضبوطی کے ساتھ پکڑ لینا) اور دیکھنا (دین میں) نئی نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچتے رہنا، اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں ہم یہ سمجھنے

(۱) سنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ وسنن ابن ماجہ، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین المھدیین۔ وسنن الدارمی، المقدمة، باب اتباع السنة۔ الفاظ کم وبیش سنن دارمی کے ہیں۔ وسنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة۔

کی کوشش کریں گے کہ سنت کیا ہے‘ اتباعِ سنت کا مقام کیا ہے اور احیائے سنت کا مرتبہ کیا ہے! وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں نمازِ فجر کے بعد وعظ و نصیحت فرمائی اور یہ ایسی نصیحت تھی کہ اس سے حاضرین کے قلوب پر رقت طاری ہوگئی‘ وہ لرز کر رہ گئے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! یہ تو ہمیں ایسے لگ رہا ہے جیسے آپؐ نے الوداعی نصیحت فرمائی ہو۔ کہیں آپؐ ہم سے رخصت تو نہیں ہو رہے؟ اور اگر یہ اسی نوعیت کی کچھ بات ہے تو ہمیں مزید وصیت فرمائیے کہ ہم آپؐ کے بعد کیا کریں؟ اگر آپؐ کے رخصت ہونے کا وقت ہے تو آپؐ کے بعد ہمارا سہارا کون ہوگا؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: ((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ)) ’’میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں جو غالب ہے اور نہایت جلالت شان والا ہے‘‘۔ دیکھئے ہم نے سورۂ آل عمران کی جو تین آیات پڑھیں ان میں سے پہلی آیت میں بھی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۰۲﴾﴾

نبی اکرم ﷺ نے پہلی وصیت اللہ کے تقویٰ کی فرمائی۔ بعدہٗ فرمایا: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ)) ’’اور میں تمہیں وصیت کرتا ہوں سمع و طاعت کی‘‘ یعنی سننے اور ماننے کی۔ نظم کی پابندی ہو‘ افتراق اور تفرقہ نہ ہو۔ سورۂ آل عمران کی دوسری آیت میں تفرقے سے بچنے کی تاکید ان الفاظ میں کی گئی ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠﴾ ’’اور مجموعی طور پر اللہ کی رسّی (قرآن حکیم) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور باہم تفرقہ میں مت پڑو!‘‘ قرآن اور حدیث میں کوئی فرق اور بُعد نہیں ہے۔ حدیث دراصل قرآن کی تبیین و تفہیم ہے۔ الفاظ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ہیں جبکہ مفہوم کُل کا کُل قرآن حکیم کا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے سمع و طاعت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ((وَاِنْ کَانَ عَبْدًا حَبْشِیًّا)) ’’خواہ تمہارا امیر ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو‘‘ پھر بھی تمہیں سمع و طاعت پر کاربند رہنا ہوگا۔ یعنی کسی غلام کا امیر و حاکم بننا تمہارے نفس پر بڑا شاق گزر سکتا ہے اور تمہارے لیے کٹھن امتحان بن سکتا ہے کہ ہم آزاد ہیں اور یہ غلام یا غلام زادہ

ہم پر امیر کیسے ہو گیا؟ نبی اکرم ﷺ نے ۸ ھ میں ایک لشکر کا امیر اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنایا اور حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں روم کی سرحدوں کی جانب بھیجے جانے والے جیش کا امیر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بنایا جن کی ماتحتی میں حضراتِ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر اصحاب بھی تھے۔ اس پر قریش کے بعض حضرات نے دبی زبان سے ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اسی سے قیاس کر لیجیے' عربوں کا ذہن یہ تھا کہ اگر غلام آزاد بھی ہو جائے تو اس کو وہ اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے' بلکہ وہ ''مولیٰ'' شمار ہوتا تھا۔ یعنی اس کے لیے غلامی اور آزادی کے درمیان کا کوئی مقام ان کے ذہن میں ہوتا تھا۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا)) ''پس تم میں سے جو کوئی بھی میرے بعد زندہ رہا وہ جلد ہی کثیر اختلافات دیکھے گا''۔ اُن اختلافات کے زمانے میں تمہارے لیے مشعل راہ کون سی ہے! تمہارے لیے روشنی کا مینار کون سا ہے! فرمایا: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) یہاں کلمہ ''فا'' بہت معنی خیز ہے۔ یہ ان اختلافات کے لیے جائے پناہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ جائے پناہ صرف یہ ہے کہ: ''پس تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھامنا''۔ کیونکہ خلفائے راشدین المہدیّین کی سنت نبی اکرم ﷺ کی سنت ہی کا تتمہ ہے۔ یہاں نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفاء الراشدین المہدیّین کی سنت کو بھی ملحق فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے لیے نجومِ ہدایت ہیں' تاہم انفرادی (individual) طور پر ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کے مصداق کسی میں زہد کا رنگ غالب ہے' کسی میں مجاہدے کا رنگ غالب ہے' کسی کو انفاق سے زیادہ اُنس ہے' کوئی نمازیں زیادہ پڑھنے سے مناسبت رکھتا ہے' لیکن جماعتی حیثیت سے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام متشکل ہو کر سامنے آتی ہے خلفائے راشدین میں۔ اس لیے کہ یہ وہ دَور تھا کہ پوری اُمتِ محمدیہؐ ایک وحدت تھی' کوئی افتراق نہیں تھا۔ دینی اور

مذہبی قیادت بھی خلفائے راشدین المہدیّین کے ہاتھ میں تھی اور سیاسی قیادت وحکمرانی بھی ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ پوری اسلامی مملکت ایک ہی تھی‘ مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ مملکتیں نہیں تھیں۔ ایک ہی نظام پوری مملکت اسلامیہ میں جاری و نافذ تھا۔ لہٰذا اُس وقت جو فیصلے ہوئے‘ یعنی خلفائے راشدین کے اجتہادات کو اگر اُمت نے تسلیم کر لیا تو ان کے اجماع ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ ان فیصلوں کی حیثیت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی مجمع علیہ سنت کی ہوگی۔ میرے نزدیک ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) کی یہ احسن اور صحیح تعبیر ہے۔ مزید برآں خلافت راشدہ نبوت کا تتمہ وتکملہ ہے۔ اسی لیے اس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔

آگے نبی اکرم ﷺ امر کے صیغے میں حکم دے رہے ہیں کہ: ((عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) ’’اسے اپنے دانتوں کی کچلیوں سے مضبوطی سے پکڑ کر رکھو‘‘۔ معلوم ہوا کہ یہ آسان کام نہیں ہے‘ بڑے دباؤ آئیں گے‘ حالات کا رُخ کچھ اور ہوگا۔ ان میں سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سنت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو بڑی مضبوطی سے تھامنا ہوگا۔ آگے فرمایا: ((وَاِيَّاكُمْ وَالْمُحْدَثَاتِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ’’اور دیکھنا نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے سے بچنا‘ کیونکہ دین میں جو نئی چیز ایجاد کی جائے گی وہ بدعت ہوگی اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے‘‘۔

## سنت کا ہمہ گیر تصور

ابھی ہم نے جس حدیث کے مفاہیم ومعانی اور مطالب کو سمجھا ہے اس میں تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے بطور وصیت چند ہدایات ارشاد فرمائیں۔ اب میں ایک دوسری حدیث پیش کر رہا ہوں جو ایک اصول کے اعتبار سے دُور کے زمانے سے متعلق ہے‘ یعنی جب وہ دَور آئے کہ اُمت میں فساد رونما ہو چکا ہو‘ بدعات کے ہجوم میں سنت گم ہوگئی ہو‘ اُس وقت مسلمان کیا رویہ اختیار کریں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ تو وہ تھا کہ جس میں سنت ایک خورشید تاباں کے مانند نصف النہار پر چمک رہی تھی‘ لیکن ایک دَور ایسا بھی آ سکتا ہے کہ سنت بدعات میں گم ہو جائے‘ بدعات کا اتنا انبار ہو کہ اس میں

تلاش کرنا مشکل ہو جائے کہ سنت کیا ہے؟ اس دَور کے متعلق ایک حدیث بیان کی جاتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں:

((مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ)) (۱)

''جب میری اُمت میں فسادِ عمومی ظاہر ہو چکا ہو' اُس وقت جو شخص میری سنت کو مضبوطی سے تھامے رہے گا تو اس کے لیے سو شہیدوں کا اجر ہے۔''

اب ان دونوں حدیثوں کو سامنے رکھیے اور بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سنت کا لفظ ہمارے ہاں ایک فقہی اصطلاح کے طور پر بھی آتا ہے۔ فقہی تقسیم اس طرح ہے کہ تعبدی اُمور میں فلاں کام فرائض ہیں' فلاں سنت ہیں' فلاں کام نوافل اور فلاں کام مستحبات ہیں۔ پھر سنن کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ یہ سنت مؤکدہ ہے اور یہ غیر مؤکدہ۔ اسی طرح چند معاشرتی و تمدنی آداب کو سنت قرار دیا جاتا ہے اور جب بھی لفظ ''سنت'' بولا جاتا ہے تو یہی تصور سامنے آجاتا ہے۔ یہ بالکل دوسری تقسیم ہے۔ اس قسم کی جزوی سنتوں کا جب ذکر ہوتا ہے تو احادیث کا اندازِ بیان عموماً یہ ہوتا ہے کہ انہیں ''مِنْ سُنَّتِيْ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) (۲) ''نکاح میری سنت میں سے ہے''۔ اور: ((اَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ: اَلتَّعَطُّرُ وَالنِّكَاحُ وَالسِّوَاكُ وَالْحَيَاءُ)) (۳) ''چار چیزیں انبیاء و رُسل (علیہم السلام) کی سنتوں میں سے ہیں: عطر لگانا' نکاح کرنا' مسواک کرنا اور حیا اختیار کرنا''۔ جبکہ لفظ ''سنت'' ایک اصطلاحِ دینی' ایک وحدت اور مجموعی اعتبار سے بولا جائے گا تو اس کا مفہوم ہوگا نبی اکرم ﷺ کا طریقہ' آپؐ کا طرزِ عمل' بحیثیت مجموعی زندگی کے معمولات میں نبی اکرم ﷺ کا قائم کردہ توازن۔ یعنی وہ نسبت و تناسب جو آنحضرت ﷺ نے معمولاتِ زندگی کے مابین برقرار رکھا۔

## نبی اکرم ﷺ کی سنتِ جلیلہ کے دو اَجزاء

نبی اکرم ﷺ کی آغازِ وحی سے الرفیق الاعلیٰ کی طرف مراجعت تک کُل کی کُل

(۱) میزان الاعتدال للذهبی ۱/۵۱۹۔ والکامل لابن عدی ۳/۱۷٤

(۲) سنن ابن ماجه' کتاب النکاح' باب ما جاء فی فضل النکاح۔

(۳) مسند احمد۔

حیاتِ طیبہ کو بحیثیت مجموعی (as a whole) لیجیے‘ تو یہ ہے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اجزاء کا معاملہ‘ اُن کی اہمیت اوران پر اجر وثواب اپنی جگہ ہے‘ کون مسلمان ہوگا جو اس سے انکار کی جرأت کر سکے؟ جس چیز کے متعلق بھی معلوم ہو جائے کہ نبی اکرم ﷺ کا طریقہ یہ تھا‘ اس کو اختیار کرنا یقیناً بہت بڑے اجر وثواب کا موجب ہوگا۔ لیکن یہ سو شہیدوں کے مساوی ثواب کی جو بشارت دی گئی ہے‘ اس کے بارے میں جان لیجیے کہ ان جزوی باتوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ بشارت نبی اکرم ﷺ کے پورے طریقے کو مضبوطی سے تھامنے سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے فرض بھی سنت کا جزو بن جائے گا۔ فرض ویسے تو سنت سے بالاتر ہے‘ لیکن جب آپ اس پہلو سے دیکھیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کا طریقہ بحیثیت مجموعی کیا ہے‘ تو اس میں فرائض بھی شامل ہیں‘ اس میں نوافل بھی ہیں‘ اس میں آپؐ کے معمولات بھی ہیں‘ شب و روز کے انداز بھی ہیں‘ جلوت بھی ہے‘ خلوت بھی ہے‘ آپؐ کے شمائل بھی ہیں۔ یہ سب مل کر جب ایک وحدت بنیں گے تو اس کا نام ہوگا ’’سنّتِ رسول‘‘ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اس میں فرائض بھی آ گئے اور نوافل بھی آ گئے۔ غرضیکہ سب کچھ آ گیا۔ یہ ہے جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ۔ اسی کا دوسرا نام ہے اُسوہ یعنی نمونہ۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

’’(اے مسلمانو!) رسول اللہ (ﷺ) کی پوری زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے‘‘۔

اس ضمن میں یہ بات میں نے متعدد بار عرض کی ہے کہ اس سنت کو آپ ہمیشہ دو حصوں میں منقسم سمجھئے۔ نبی اکرم ﷺ کی سنت یعنی آپؐ کے طریقے کا سب سے پہلا اور اہم جزو ہے ’’عبدیت‘‘ —— یہ عبدیت آپؐ کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ زندگی کے ہر گوشے میں سب سے غالب عنصر عبدیت کا ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں کھانا غلاموں کی طرح بیٹھ کر کھاتا ہوں۔ آپؐ کی پوری حیاتِ طیبہ پر اوّلین اور نمایاں ترین چھاپ اسی عبدیت کی ہے۔ آپ ﷺ عبدیتِ کاملہ کے مظہرِ اتم ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عبدیت اُس برف کے تودے (iceberg) کے مانند ہے کہ جس کا بہت بڑا حصہ پانی میں چھپا ہوتا ہے' بس تھوڑا سا حصہ (tip) نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ رات کی تاریکیوں اور تنہائیوں میں ''عبداللہ'' اپنے ربّ کے حضور میں کھڑا ہوتا تھا (ﷺ) وہ بات ہی کچھ اور تھی۔ اس عبدیت کی وہ کیفیات بھی ہیں کہ: ((اِنِّـیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ))(۱) ''میں تو اس حال میں رات بسر کرتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے''۔ یہ معاملہ کہاں ہمارے فہم میں اور ہماری سمجھ میں آئے گا! ایک عظیم ماثور دعا ہے جس میں نبی اکرم ﷺ پہلے اپنی زبانِ مبارک سے اپنی عبدیت کا اظہار فرماتے ہیں' پھر قرآن مجید کا ''شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ'' ہونے کا جو وصف ہے اس کے لیے دُعا فرماتے ہیں:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ فِیْ قَبْضَتِكَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَكَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَكْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَھَابَ ھَمِّیْ وَ غَمِّیْ))(۲) (آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ)

''اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں۔ تیرے ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں۔ مجھ پر تیرا ہی کامل اختیار ہے اور میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ نافذ ہے میرے بارے میں تیرا ہر حکم اور عدل ہے میرے معاملے میں تیرا ہر فیصلہ۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں تیرے ہر اُس اسمِ پاک کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا' یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا' یا اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا یا اُسے اپنے مخصوص خزانۂ غیب ہی میں محفوظ رکھا —— کہ تو بنا دے قرآن مجید کو میرے دل کی بہار' اور میرے سینے کا نور' اور میرے رنج وحزن کی جلا اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب''۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن الوصال فی الصوم۔

(۲) مسند احمد۔

(ایسا ہی ہو اے تمام جہانوں کے پروردگار!)

سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا جو دوسرا جزوِ اعظم ہے وہ کُل کا کُل ظاہر ہے' نمایاں ہے اور آنکھوں کے سامنے بالکل عیاں ہے۔ وہ ہے سنتِ دعوت' سنتِ تبلیغ' سنتِ انذار' سنتِ تبشیر' سنتِ شہادت علی الناس' سنتِ اظہار دین الحق علی الدین کُلِّہٖ' سنتِ تکبیر ربّ' سنتِ اعلائے کلمۃ اللہ' سنتِ ہجرت اور سنت جہاد وقتال۔

## عظیم ترین اور متواتر سنت

اجرائے وحی اور یوم ِبعثت سے لے کر اس حیاتِ دُنیوی کے آخری سانس تک نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی اسی سنت اور اسی طریق کے محور کے گرد گھوم رہی ہے۔اس سے بڑی کسی سنت کا تصور ممکن نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت وشخصیت کا نمایاں ترین پہلو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھ لیجیے آپ کو یہی نظر آئے گا کہ دعوت ہے' تبلیغ ہے' تلقین ہے' حق کی طرف بلانا ہے' امر بالمعروف ہے' نہی عن المنکر ہے' دین حق کو سربلند کرنے کی سعی و جہد ہے۔اس کے لیے تمسخر واستہزاء انگیز کیا جارہا ہے' پتھروں کی بارش جھیلی جارہی ہے' معاشی و معاشرتی مقاطعہ برداشت کیا جارہا ہے۔اسی کے لیے مجاہدہ ہے' کشمکش ہے' تصادم ہے اور اسی کے لیے گھر بار کو چھوڑا جارہا ہے۔اسی مقصد کی تکمیل کے لیے ایک جماعت کو منظّم کیا جارہا ہے اور جماعت سے وابستگان کا تزکیۂ نفس ہورہا ہے۔اسی کے لیے جہاد مع النفس اور قتال بالسیف ہے۔اسی کے لیے نظروں کے سامنے عزیز ترین جاں نثاروں کے تڑپتے ہوئے لاشے اور مثلہ شدہ نعشیں ہیں۔ یہ تمام دوسری سنت کے اجزاء ہیں۔اب ان دونوں اجزاء یعنی سنت عبدیت اور سنت دعوت کو جمع کیجیے تو سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ایک وحدت کی حیثیت سے سامنے آئے گی۔

اب اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے طریقے میں سے نماز والی سنت تو لے لے مگر دعوت وتبلیغ والی سنت کو ساقط کر دے تو معلوم ہوا کہ اس کا تصورِ سنت بہت ناقص ہے۔آج تو معاملہ یہ ہورہا ہے کہ نماز میں بھی چھوٹی چھوٹی سنتوں پر ہی ساری گفتگو ہے۔رفع یدین اور آمین بالجہر سے بات آگے نہیں بڑھتی۔اگر ایسا ہو کہ اس پورے

نقشے کے اندر سنت عبدیت اور سنت دعوت کو پوری طرح قائم کر کے ان جزئیات پر بھی گفتگو ہو تو کیا کہنے! نورٌ علیٰ نور والی کیفیت ہو گی۔ لیکن اس کے بغیر یہ مسائل بے بنیاد' بے وزن اور بے اصل ہیں۔ درحقیقت اُس سنت کا احیاء مطلوب ہے جو عبارت ہے آپ ﷺ کی پوری زندگی سے۔ مبارک ہیں' تہنیت کے قابل ہیں وہ لوگ جنہیں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ شغف ہے' بایں معنی کہ سنت نبی اکرم ﷺ کے پورے طریق کا نام ہے' جس میں عبدیت بھی ہے اور دعوت بھی۔ اور یہ کام آسان نہیں ہے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

لیکن مسواک کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ سو شہیدوں کا ثواب حاصل ہو گیا' کیا کہنے ہیں! اس سے زیادہ سہل الحصول (made easy) معاملہ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اس طرح وہ شہادت یعنی راہِ حق میں نقد جاں کا نذرانہ پیش کرنا تو بالکل ہی بے وقعت اور بے معنی ہو کر رہ گئی۔

ہمارے تصوراتِ دین اور تصوراتِ سنت میں جو عدم مناسبت اور عدم توازن نظر آ رہا ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے جزو کو کُل اور کُل کو جزو بنا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سارا معاملہ تلپٹ ہو گیا اور اقدار کی عمارت (value structure) بالکل مسمار ہو کر رہ گئی۔ لہٰذا اس کو ذہن میں رکھیے کہ صحیح اور حقیقی تصورِ سنت محیط ہے سنتِ عبدیت اور سنتِ دعوت کو۔ کتنی درست بات کہی ہے علامہ اقبال نے کہ:

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست!

ہمارے دین کی صحیح تعبیر یہی ہے کہ دین نام ہے اتباعِ رسول ﷺ کا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ چنانچہ پہنچاؤ اپنے آپ کو نبی اکرم ﷺ سے قریب تر اور اس کا واحد راستہ ہے آپؐ کی سنت کی پیروی' آپؐ کے طریق پر عمل' آپؐ کا کامل اتباع۔ اگر یہ نہیں ہے' یعنی اگر سنتِ رسولؐ تک رسائی نہیں ہوئی' اگر وہاں تک نہیں پہنچے تو یہ پھر تمام بولہبی

ہے! میرے نزدیک یہ ہے صحیح تصورِ سنت۔ یہ ہے مقامِ سنت اور موجودہ دَور میں اتباعِ رسول ﷺ اور احیائے سنت کا تقاضا —— سنت عبدیت اور سنت دعوت کا اس کے تمام مراحل کے ساتھ اتباع۔

## اللہ تعالیٰ کے ولی کون ہیں؟

اب ہم دوسری حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی 'صحیح بخاری' میں روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں ایک تصور ایسا آ رہا ہے جس سے بعض اُن باتوں کا اثبات ہوگا جو صوفیاء کے حلقے کی ہیں۔ ہمارے ہاں اس معاملے میں بڑی افراط وتفریط ہے۔ یا تو وہ لوگ ہیں جو اِن باتوں کو سرے سے غلط اور سرتاسر باطل سمجھتے ہیں' ان کے کسی جزو کو بھی صحیح نہیں خیال کرتے۔ تو اس معاملے کا ایک رُخ یہ ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ ساری گفتگو کراماتِ اولیاء ہی کی ہو رہی ہے' آگے پیچھے دوسری کوئی بات ہی نہیں۔ سارا معاملہ بزرگانِ دین کا ہے اور بزرگانِ دین کا سارا معاملہ کرامات اور خرقِ عادت واقعات پر موقوف نظر آتا ہے۔ اس حلقے کے گُل دینی تصورات اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ بس یہی چیزیں ان کا دین بن کر رہ گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں بھی جو نقطۂ اعتدال ہے اس کو اس حدیث شریف کے حوالے سے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ پہلے اس حدیث کے بارے میں چند اہم امور جان لیجیے۔ یہ حدیث قدسی ہے۔ یعنی یہ فرمانِ الٰہی ہے جس کو نقل فرما رہے ہیں خود جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ سے پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔ سند کے اعتبار سے اس کا جو درجہ ہے' اس کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اپنی ''صحیح'' میں روایت کیا ہے' جس کے متعلق علمائے اُمت کا اجماع ہے کہ یہ اَصَحُّ الکُتُب بعدَ کتابِ اللّٰہ یعنی قرآن حکیم کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ : مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ

اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ ، وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ ، فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا ، وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّہٗ)) (۱)

زیرمطالعہ حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے پہلی بات فرمائی: ((اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَالَ : مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ)) ''بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس کسی نے میرے کسی ولی (دوست) سے دشمنی کی تو اُس کے لیے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے''۔ یہاں لفظ ''ولی'' قابلِ غور ہے۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ اللہ کے ولی (دوست) ہوتے ہیں۔ یہی بات قرآن مجید سے بھی بایں الفاظ ثابت ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ (یونس) ''آگاہ رہو! بلاشبہ جو اللہ کے ولی (دوست) ہیں ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے''۔ پھر ولایت یک طرفہ نہیں، بلکہ اس کا معاملہ دوطرفہ ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ''اللہ اُن لوگوں کا ولی (دوست) ہے جو ایمان لائے ہیں، وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے''۔ اب یہ بات قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں سے ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا ولی ہے اور اہل ایمان اللہ کے ولی ہیں۔ گویا ولایت کا معاملہ دوطرفہ ہے۔

اب اصل میں اس لفظ ''ولی'' کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اس کے مفہوم کا بھی ہم نے اپنے ذہن میں کچھ اور ہی نقشہ قائم کر رکھا ہے۔ عربی بڑی وسیع المعانی زبان ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ قریب المعانی ہوتے ہیں، لیکن ہر ایک کے معنی اور مفہوم میں ایک لطیف فرق ضرور ہوتا ہے۔ عربی میں دوست کے لیے جو الفاظ مستعمل ہیں، ان میں سے ہر ایک کے مفہوم میں فرق ہے۔ جیسے ''صَدِیق'' کے معنی میں سچی اور بے تکلفی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع۔

کی دوستی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اور ''رفیق'' کے معنی میں باہمی دمسازی و ہمدردی کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ یہ رِفق سے بنا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ کو محسوس کرنے والے ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اسی دوستی کے لیے ایک لفظ ہے ''خلیل''۔ یہ خُلّت سے بنا ہے' اس کے معنی میں انتہائی غالب محبت بھری دوستی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے:

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾﴾ (النساء)

''اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا دوست بنا لیا تھا''۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امتیازی شان ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا مِنْ اُمَّتِيْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ)) (۱)

''اگر میں اپنی اُمت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو بناتا''۔

معلوم ہوا کہ اس پوری دنیا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیل کوئی نہیں ہے۔ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ ؐ کے خلیل نہیں ہوئے تو اور کون ہوگا؟ پس آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے خلت کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے رکھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ رفیع کے اعتبار سے شرک فی الخُلّت کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارا نہیں فرمایا۔ اب آیئے سمجھیں کہ ''ولی'' کے معنی کیا ہیں؟ ولی بھی عربی کا بڑا وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس میں پشت پناہ' حمایتی' مددگار اور دوست کے مفاہیم شامل ہیں۔ ان سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب اس حدیث کے مضمون کو سمجھئے۔

## ولایت کی شرطِ لازم: حمیتِ دینی

اس حدیث کے مطالعے سے پہلی اور نمایاں بات یہ سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کو ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ واضح رہے کہ ایک ہے تکلیف میں نہ دیکھ سکنا اور ایک ہے اس کی ذلت و رسوائی کو برداشت نہ کرنا' جس کو ہم غیرت و حمیت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت غیور ہے اور وہ اپنے کسی ولی کی ذلت و رسوائی کو برداشت نہیں کرتا۔ اسی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب الخوخۃ والممر فی المسجد۔

طرح جو اللہ کے ولی ہیں وہ اس کے دین کے لیے غیرت وحمیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کے لیے تو کوئی مدد نہیں چاہیے۔ اللہ کو اپنی ذاتی حیثیت سے تو کوئی پشت پناہ درکار نہیں۔ اللہ تعالیٰ عاجز نہیں ہے کہ اُسے اپنی ذات کے لیے حمایتی اور پشتیبان کی ضرورت ہو۔ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ۔ سورۂ بنی اسراءیل کے آخر میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ (آیت ۱۱۱) ’’اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو‘‘۔ اللہ کو جو حمایت مطلوب ہے‘ اللہ کو جو پشت پناہی مطلوب ہے‘ اللہ کو جو غیرت درکار ہے‘ اللہ کو جس حمیت کی ضرورت ہے‘ وہ ہے اس کے دین کی۔ اپنے دین کے لیے وہ قرض بھی مانگتا ہے:

﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾﴾ (التغابن)

’’اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا‘ اللہ بڑا قدر دان بُردبار ہے۔‘‘

اپنے دین کے لیے وہ مدد کی پکار بھی لگاتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (الصّف:۱۴)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو‘ اللہ کے مددگار بنو!‘‘

اللہ کے دین کے لیے پیسہ خرچ کرو تو یہ اللہ کو قرضہ حسنہ دینا ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرو تو یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد شمار ہوگی۔ اللہ کے دین کی غیرت وحمیت ہے تو یہ اللہ کی ولایت ہے۔ یہ ہے حقیقی ولایت۔ وہ ولایت نہیں ہے کہ دین سرنگوں ہو‘ ہوا کرے۔ حدود اللہ پامال ہوں‘ ہوتی رہیں۔ شعائرِ دین کا مذاق اڑ رہا ہو‘ اڑتا رہے۔ وہ اپنی تہجد میں‘ اپنے نوافل میں‘ اپنی تسبیحوں میں اور اپنے مراقبوں اور چلّوں میں مگن ہے۔ یہ ولایت نہیں‘ یہ عبادت گزاری نہیں‘ بلکہ یہ تو معاندانہ طرزِ عمل ہے۔ یہ نسبتِ ولایت نہیں ہے‘ بلکہ یہ تو مُنہ پر دے ماری جانے والی چیز ہے۔

یہاں وہ حدیث سامنے رکھیے جو ایک مؤمن صادق کے جسم وجان پر لرزہ طاری

کر دیتی ہے اور قلبِ حساس کانپ کانپ جاتا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَئِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا :قَالَ فَقَالَ :یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھَا عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ، قَالَ فَقَالَ :اقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ!)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ فلاں فلاں بستیوں کو اُن کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو!'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس پر حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا: ''اے میرے ربّ! ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے چشمِ زدن کی مدت تک بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی!'' آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اُلٹ دو انہیں پہلے اس پر پھر دوسروں پر، اس لیے کہ اس کے چہرے کی رنگت کبھی میری (غیرت اور حمیت کی) وجہ سے متغیر نہیں ہوئی''۔

غور کیجیے کہ اس بندۂ عابد کی عبادت گزاری کی شہادت کون دے رہے ہیں اور کیا دے رہے ہیں؟ گواہی دے رہے ہیں حضرت جبرئیل امینؑ، کوئی کرائے کا وکیل نہیں۔ وہاں دے رہے ہیں جہاں ابوجہل بھی جھوٹ نہیں بول سکے گا: ﴿یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ؕ لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾﴾ اور گواہی یہ دی جا رہی ہے کہ اس بندۂ عابد نے آنکھ جھپکنے کی مدت بھی اللہ تعالیٰ کی معصیت میں بسر نہیں کی۔ یہاں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ایک شخص کی ذاتی عبادت اور نیکی کا یہ عالَم ہے۔ لیکن بارگاہِ خداوندی سے حکم یہ صادر ہوا کہ اَقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ ''اُلٹو پہلے اس پر پھر دوسروں پر''۔ کیوں؟ فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ ''اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری (غیرت وحمیت) کی وجہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا''۔ یہ بے غیرت اور بے حمیت انسان اسی سزا کا مستحق ہے کہ میرا عذاب پہلے اس پر نازل ہو، پھر دوسروں پر۔

حمیت و غیرت دین دراصل ایمان باللہ کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس حمیت و

غیرتِ حق کے بغیر نہ ولایت کی کوئی ادنیٰ سی نسبت ہے نہ کوئی انفرادی عبادت' کوئی زہد اور کوئی ریاضت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے۔ تواصی بالحق' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' دعوت الی اللہ' اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی و جہد اسی غیرتِ حق اور حمیتِ دینی کے عملی مظاہر ہیں۔ یہ دین کی پشت پناہی اور نصرت ہے۔ ان چیزوں سے اگر زندگی خالی ہے اور انفرادی زہد و عبادت اور وظائف و اَوراد ہیں تو ولایت کی نسبت کا کوئی سوال نہیں۔ ان تمام ریاضتوں کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پرِ کاہ کے برابر بھی نہ وقعت ہے اور نہ وزن ہے۔ کسی کی والدہ کی شان میں کوئی شخص کوئی گستاخانہ بات کہہ بیٹھے تو اس کے پورے جسم کا خون چہرے پر جمع ہو جائے گا' وہ مرنے مارنے پر تل جائے گا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی ہوتی رہے' اس کے دین کا مذاق اڑتا رہے اور کوئی اپنی نفلی عبادت و ریاضت میں مگن رہے تو اسے ولایت سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ یہ تو ابلیس کا مشن ہے جسے علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

چنانچہ ولایت کا حقیقی مفہوم ہے غیرتِ حق' حمیت دینی' دین کی پشت پناہی' اس کی نصرت' اس کے غلبہ و اقامت کے لیے جہاد و قتال۔ اگر ولی کا یہ تصور آپ نے جان لیا تو اس کا منطقی نتیجہ بھی سمجھ میں آ جائے گا کہ: ((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ)) ''جس نے میرے کسی ولی سے عداوت رکھی اُس کے خلاف میرا اعلانِ جنگ ہے!'' جو شخص ہمہ تن میرے دین کا حمایتی بنا ہوا ہے اُسے میں چھوڑ دوں' یہ کیسے ممکن ہے! جو اللہ کا ولی ہے اللہ بھی تو اس کا ولی ہے۔ پس فرمایا کہ جس شخص نے میرے ولی کے ساتھ دشمنی رکھی تو اس کے خلاف میں اعلانِ جنگ کر چکا ہوں۔ یہاں ''قَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ'' فرمایا گیا۔ عربی میں فعل ماضی پر جب قَـــــدْ لگتا ہے تو ''Present Perfect Tense'' کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کام کا ہو چکنا مراد ہوتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی جنگ ہماری آپس کی جنگ کی طرح نہیں ہوتی۔ اللہ تلوار لے کر نہیں آتا۔ اللہ کی جنگ کے لیے

مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔ اللہ بھی چال چلتا ہے اور خفیہ تدبیر کرتا ہے: ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝۱۵ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝۱۶﴾ (الطارق) ''یہ لوگ کچھ چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی ایک چال چل رہا ہوں''۔ اور: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۵۴﴾ (آل عمران) ''اور وہ (بنی اسرائیل) خفیہ تدبیریں کرنے لگے اور اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی' اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے''۔ اللہ کی چالوں میں سے ایک بہت بڑی چال ہے ڈھیل دینا اور رسّی دراز کرنا۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝۱۷﴾ (الطارق) ''(اے نبیؐ!) پس ڈھیل دیجیے ان کافروں کو' ڈھیل دیجیے ان کو ایک مدت تک''۔ اللہ تعالیٰ کافروں کی رسّی دراز کرتا ہے تاکہ وہ ذرا اور جری ہو جائیں اور اپنا خبثِ باطن پوری طرح ظاہر کر لیں۔ اس کے بعد پھر اللہ کی پکڑ آ جاتی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۴﴾ (القلم) ''ہم ایسے طریقے سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی''۔ اس استدراج کے تصور سے مؤمنین صادقین ہر دَور میں لرزاں و ترساں رہے ہیں۔ ایک شخص غلط راستے پر جا رہا ہے اور لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دے رہا ہے' ایک ہجوم اس کے پیچھے لگ گیا ہے' زندہ باد کے نعرے ہیں' پھولوں کی بارش ہے' اس کے ہاتھ اور پاؤں چومے جا رہے ہیں' وہ سمجھ رہا ہے کہ میں کامیاب ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ استدراج ہے' اللہ ڈور ڈھیلی کر رہا ہے' کانٹا حلق میں پھنسا ہوا ہے' وہ جا کہیں نہیں سکتا۔ یہ مہلت ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝۴۵﴾ ''میں اُن کی رسّی دراز کر رہا ہوں' یقیناً میری چال بہت مضبوط اور پختہ ہے''۔ اس میں کسی ضعف کا کوئی سوال نہیں ہے۔ میری ڈور تڑا کر کوئی مچھلی جا نہیں سکتی' لہٰذا مجھے جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔

بہرحال ولایت ایک دوطرفہ نسبت ہے بندے اور ربّ کے درمیان۔ اور جس نے بھی اللہ کے ولی سے دشمنی رکھی اس کے خلاف اللہ تعالیٰ اعلانِ جنگ فرما چکا۔ ولایت کی نسبت میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ وہ دراصل غیرت و حمیتِ دینی اور دین کی

نصرت و پشت پناہی کا نام ہے۔ معلوم ہوا کہ سنت کا اور ولایت کا جو مفہوم میں نے بیان کیا ہے وہ دونوں باہم قریب آ گئے۔ کسی شہر کے بہت سے دروازے ہوں تو جس دروازے سے بھی داخل ہوں گے اُسی شہر میں داخل ہوں گے۔

## تقرب الی اللہ کے ذرائع

زیر مطالعہ حدیث قدسی میں اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا تقرب حاصل کرنے کے دو ذرائع ہیں۔ یہاں ایک ضمنی لیکن اہم بات ذہن نشین کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جا سکتا ہے اور حاصل کیا جانا چاہیے۔ یہ کوئی نظریاتی و خیالی (theoretical) بات نہیں ہے۔ پوری شریعت' پوری طریقت اور کُل سلوک کا لبِّ لباب اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ تقرب الی اللہ ہے۔ شریعت کے معنی بھی چلنا' طریقت کے معنی بھی چلنا اور سلوک کے معنی بھی چلنا ہیں۔ تینوں الفاظ کے مفاہیم میں باریک سا فرق ہے' لیکن تینوں میں چلنے کا مفہوم مشترک ہے۔ چلنا کس لیے ہوتا ہے؟ کسی منزل سے قریب ہونے کے لیے! منزل کیا ہے؟ وہ ہے قربِ الٰہی۔ اب دوسرے الفاظ دیکھئے: صراط' صراطِ مستقیم' صراط السوی' سواء السبیل' قصد السبیل۔ ان سب الفاظ میں راستے کا مفہوم مشترک ہے۔ راستے کا مقصود کیا ہوتا ہے؟ کسی منزل تک پہنچانا۔ منزل کیا ہے؟ اللہ کا تقرب۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ﴾ (النحل:۹) ''اور اللہ کے ذمے ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ ٹیڑھے راستے بھی بہت سے موجود ہیں''۔ قصد السبیل وہ سیدھا راستہ ہے جو عین اللہ تعالیٰ کے پاس لے جاتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ یہ سڑک وہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔ ٹیڑھے راستے آپ کو اِدھر اُدھر بھٹکا دیں گے۔

اس حدیث میں جو بہت ہی قیمتی حدیث ہے' بہت ہی اہم حدیث ہے' تقرب الی اللہ کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں۔ ایک تقرب بالفرائض اور دوسرا تقرب بالنوافل۔ ان دونوں میں بڑی عجیب (پیاری) نسبت ہے۔ تقرب بالفرائض اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب اور پسند ہے۔ چنانچہ فرمایا: ((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا

افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ)) ''اور میرا بندہ میری کسی پسندیدہ شے کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہے تو میں نے اُس پر جو کچھ فرض کیا ہے اس سے بڑھ کر کسی اور ذریعے سے نہیں حاصل کر سکتا''۔ یہ ہے تقرب بالفرائض۔ اب دوسرے ذریعے کو سمجھئے وہ کیا ہے؟ وہ ہے تقرب بالنوافل۔ دیکھئے یہاں لفظ سنت نہیں آیا۔ یہاں فرض کے بعد فوراً نفل آ گیا۔ یہ ایک اور انداز سے ترتیب ہے۔ ایک وہ چیز ہے جو اللہ نے لازم کر دی ہے' فرض کر دی ہے (اس پر آگے بحث ہوگی کہ وہ فرض کیا کیا ہیں) ایک اس سے آگے کا مرحلہ ہے جو ایک بندۂ مؤمن اپنی آزاد مرضی سے کرتا ہے' وہ نفل ہے۔ یہ تقسیم دین کے ہر میدان اور ہر شعبے میں ہے۔ پنج وقتہ نماز فرض ہے' اس کے علاوہ نماز نفل بھی ہے۔ اسی طرح صدقاتِ واجبہ ہیں' زکوٰۃ ہے' عشر ہے' جبکہ صدقاتِ نافلہ بھی ہیں جو زکوٰۃ کے علاوہ کیے جانے چاہئیں۔ رمضان کے روزے فرض ہیں' باقی نفلی روزے جو جتنے چاہے رکھے۔ صاحبِ استطاعت پر ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے' باقی جتنے چاہے حج کرے وہ نفل ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ایک درجہ وہ ہے جس کا بجالانا لازم ہے۔ اس پر ایک اضافی اور بالاتر درجہ ہے وہ نفل ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں۔ اس میں جو جتنا چاہے آگے بڑھے' سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔ لہٰذا پہلے فرمایا: ((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ اَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ)) یعنی میں نے اپنے بندے پر جو چیزیں فرض کی ہیں' ان کو بجالا کر مجھ سے جو تقرب حاصل کرتا ہے تو یہ عمل مجھے محبوب ترین ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی فرمایا: ((وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ)) ''اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے مجھ سے قریب تر ہوتا رہتا ہے''۔ میرا بندہ اگر نوافل کے ذریعے میرا تقرب تلاش کرتا رہے' کوشاں رہے' اس میں پیہم جدّ و جہد کرے' بڑھتا چلا جائے تو اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ: ((حَتّٰى اُحِبَّهٗ)) ''یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں''۔ بڑا عجیب اور پیارا انداز ہے۔ شخصاً محبوب وہ ہے جو تقرب بالنوافل کی منزلیں طے کر رہا ہے' جبکہ طریقے کے اعتبار سے محبوب تقرب بالفرائض

ہے۔اب دیکھئے کہ محبوبیت خداوندی کے لیے الفاظ کیا آئے ہیں۔اگر کوئی انسان یہ الفاظ کہتا تو وہ کافر اور مشرک قرار پاتا۔یہ تو عینیت ہو جاتی۔اس میں اللہ اور بندے کی تقسیم ختم ہو جاتی اور نمعلوم کتنی پیچیدگیاں اور دشواریاں پیش آتیں اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا۔لیکن غور کیجیے یہ کلام کس کا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا! یہ حدیث قدسی ہے۔نقل کون فرما رہے ہیں؟ الصادق المصدوق جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ۔الفاظ ملاحظہ کیجیے: ((فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا)) ''پس جب میں اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہوں تو میں اُس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اور میں اُس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے' اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے''۔اللہ اکبر! ہم کہہ سکتے ہیں یہ الفاظ؟ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' یہ حدیث قدسی ہے اور صحیح بخاری کی روایت ہے۔اِن شاء اللہ آگے جب میں اس حدیث کی مزید شرح کروں گا تو توقع ہے کہ بات واضح ہو جائے گی۔

حدیث شریف میں آگے فرمایا: ((وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ)) ''اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں لازماً اس کا سوال پورا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں لازماً اسے پناہ دیتا ہوں''۔

## کرامت اولیاء کا اثبات

اس حدیث شریف کے مطالب و مفاہیم سے جو ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے اب اسے جان لیجیے۔کرامتِ اولیاء کے لیے یہ حدیث سند ہے' نص ہے۔اللہ جس بندے کے پاؤں بن جائے اس کی رفتار کو آپ کس پیمانے سے ناپیں گے؟ برق کی رفتار تو اس سے کہیں پیچھے رہ جائے گی۔اسی طرح جس کی آنکھ اللہ بن جائے اس کے بارے میں یہ سوچا جائے کہ اس نے یہ کیسے دیکھ لیا؟ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے منبر پر بیٹھے شام کا میدانِ جنگ کیسے دیکھ لیا؟ یہ ''کیسے'' کا سوال کسی کے ذہن میں آیا تو

یہ حماقت اور پاگل پن ہے۔اس میں کسی کو اگر استبعاد محسوس ہو تو اس نے موٹی سی بات نہیں سمجھی۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))(۱) ''مؤمن کی فراست سے بچو اور ڈرو، اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھ رہا ہوتا ہے''۔ایکسریز آپ کے جسم میں سے گزر جائیں تو اس کی خفیف ترین چیز کو بھی ظاہر کر دیتی ہیں، تو اللہ کا نور کس کس چیز کو چیر جائے گا!

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!

یہ کیفیت ہے جو کبھی کبھی طاری ہوتی ہے۔خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً))(۲) یعنی اے حنظلہ! یہ کیفیات مستقلاً نہیں ہوا کرتیں، کبھی کبھی نصیب ہوتی ہیں۔

پس اس حدیث سے اصولاً کراماتِ اولیاء کا اثبات ہوتا ہے۔جو شخص اس حدیث کو صحیح مانتا ہے اسے اس بات کو بھی ماننا پڑے گا۔اسے ان تمام باتوں کو تسلیم کرنا ہوگا جو اس میں بیان ہوئی ہیں۔البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ ان کو ہم امکانی حد تک صحیح تسلیم کریں گے۔کسی معین واقعہ کے متعلق یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ہو سکتا ہے کہ کوئی استدراج یا امہال وتمہیل کا معاملہ ہو، یا شیطان نے کسی کو کوئی بات سجھا دی ہو، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔اس لیے کہ شیطان کے وار سے محفوظ صرف نبی ہوتا ہے، باقی کوئی شخص محفوظ نہیں۔بڑے سے بڑا ولی محفوظ نہیں۔محفوظیت اور معصومیت صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا خاصّہ ہے۔لہٰذا بڑے سے بڑے ولی کو بھی کسی وقت شیطان چکمہ دے سکتا ہے۔اس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو چکمہ دینے کی کوشش کی۔احادیث میں ایسے واقعات موجود ہیں۔نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے ایسے چند واقعات سن کر فرمایا کہ تم نے پہچانا نہیں، یہ شیطان تھا! ساتھ ہی آنجناب ﷺ نے

(۱) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ۔ باب ومن سورۃ الحجر۔
(۲) صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فضل دوام الذکر والفکر ..... الخ۔

متنبہ فرما دیا تھا کہ:

((مَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِیْ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ فِیْ صُوْرَتِیْ))(۱)

''جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے واقعی مجھے ہی دیکھا ہے' کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا''۔

اگر کوئی یہ کہے کہ خواب میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی روح نے مجھ سے یہ کہا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شیطانِ لعین نے کوئی الٹی پٹی پڑھائی ہو اور کہا ہو کہ میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی روح ہوں۔

ان دونوں چیزوں کو پیش نظر رکھیے۔ مطلقاً انکار کر دینا کہ ہو ہی نہیں سکتا' ناممکن ہے' محال ہے' یہ طرزِ فکر اس حدیث کے خلاف ہے۔ اللہ اپنے اولیاء کا کان بنتا ہے' آنکھ بنتا ہے' ہاتھ بنتا ہے' پاؤں بنتا ہے' یہ اس حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن کسی معین واقعے کے بارے میں حتمیت' قطعیت اور یقین کے ساتھ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ کسی شخص معین پر ایمان لانے کا ہمیں مکلّف نہیں ٹھہرایا گیا۔ جناب محمد ﷺ آخری ہستی ہیں جن پر ایمان کا مطالبہ ہے۔ آگے نہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر نہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ایمان لانے کا مطالبہ ہے اور نہ کسی اور صحابی پر۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ جب خلفاء راشدین المہدیّین اور دیگر صحابہ کرامؓ پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں ہے تو اولیاء اللہ پر' چاہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہوں' چاہے معین الدین اجمیریؒ ہوں' کسے باشد' ایمان لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معصوم نہیں مانتے۔ ان سے بھی خطا ہو سکتی ہے' لیکن وہ خطائے اجتہادی ہو گی' اس میں بدنیتی یا نفسانیت ہرگز نہیں ہو گی۔ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عَدُوْلٌ ۔ چنانچہ اولیاء اللہ سے بھی غلطیوں کا صدور ممکن ہے۔ لہٰذا ایک تو یہ توازن پیدا کرنا ہے کہ ان چیزوں کا بالکل انکار کر دینا درحقیقت دین کی ایک اہم اور بہت بڑی حقیقت کی طرف سے اپنی آنکھوں کا بند کر لینا

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب اثم من کذب علی النبی۔ وصحیح مسلم' کتاب الرؤیا' باب قول النبی ﷺ من رآنی فی المنام فقد رآنی۔

ہے۔اگر چہ تعین کے ساتھ کسی بات کی نہ ہم تصدیق کریں گے' نہ توثیق کریں گے اور نہ تکذیب کریں گے۔وہ جانے اور اس کا ربّ جانے۔ ہمارے لیے اصل دلیل اور حجت صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔تصوف کے حلقے میں یہ بات مانی جاتی ہے کہ کسی ولی کا کشف دوسرے کے لیے دلیل و حجت نہیں ہے۔ ہاں اگر صاحب کشف کو یہ اطمینان ہو کہ مجھ پر صحیح بات منکشف ہوئی ہے تو اس کے لیے وہ کشف دلیل و حجت ہو جائے گا۔آخر انسان کی فطرت بھی تو رہنمائی کرتی ہے۔ایک گواہی اندر سے بھی تو اس کو حاصل ہوتی ہے۔اگر اسے یقین ہو جائے کہ اس کشف میں شیطنت نہیں' بلکہ یہ خدائی الہام اور رحمانی القاء ہے تو اس پر وہ حجت ہو جائے گا' بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کے منافی نہ ہو۔ باقی رہا دوسروں کا معاملہ' تو اگر کسی ولی کا کشف قرآن وسنت کے مطابق بھی ہو تو کسی دوسرے کے لیے حجت نہیں ہے۔دین میں حجت کوئی چیز ہے تو وہ صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ جو بات مانی جائے گی وہ اس دلیل اور بنیاد پر مانی جائے گی۔ اُصولی طور پر اس بات کو صوفیاء کے حلقے بھی تسلیم کرتے ہیں۔

## تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل میں نسبت وتناسب

تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل میں جو نسبت ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔اس کو میں دو مثالوں سے آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ افضل طریقہ جو ہے وہ تقرب بالفرائض ہے' اگر چہ اعلیٰ طریقہ اور بلند تر منزل جو ہے وہ تقرب بالنوافل ہے۔ ہمارا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ افضل ترین ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔لیکن ایک صحبت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ایمان کی گفتگو شروع ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ ''تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟''یعنی سب سے زیادہ دلکش' دل آویز اور پیارا ایمان کس کا ہے؟ صحابہ کرامؓ نے خوب غور کر کے عرض کیا کہ ''ملائکہ کا ہے!'' آنجناب ﷺ نے فرمایا: ''ملائکہ کیسے ایمان

نہیں لائیں گے وہ تو اللہ کے حضور میں ہیں‘ اللہ کا وجود اُن کے لیے غیب نہیں‘‘۔ صحابہؓ نے پھر سوچا اور ترمیم کر کے عرض کیا کہ ’’انبیاء کا ہے!‘‘ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ’’وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے‘ ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے‘ اللہ کے فرشتے ان کے پاس آتے جاتے ہیں اور اللہ کا پیغام لاتے ہیں!‘‘ اب صحابہ کرامؓ نے جھجکتے جھجکتے کہا کہ ’’پھر ہمارا ہے!‘‘ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’تم کیسے ایمان نہیں لاؤ گے‘ جبکہ تم نے مجھے دیکھا ہے‘ میری صحبت سے فیض یاب ہوئے ہو! میرے نزدیک خوبصورت ترین ایمان‘ دلکش ترین اور دل آویز ترین ایمان ہمارے اُن بھائیوں کا ہوگا جو ہمارے بعد آئیں گے‘ انہیں اللہ کی کتاب ملے گی اور وہ اس کے مشمولات پر ایمان لائیں گے۔ ان کا ایمان اَعجب یعنی حسین ترین‘ دلکش ترین اور خوبصورت ترین ہے‘‘۔ یہ حدیث مشکوٰۃ میں ہے۔ میں نے اس کی تشریح بیان کی ہے۔ حدیث کا متن بھی ملاحظہ کر لیجیے:

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَيُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِلَيْكُمْ اِيْمَانًا؟)) قَالُوا: الْمَلَائِكَةُ، قَالَ: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) قَالُوْا: فَالنَّبِيُّوْنَ، قَالَ: ((وَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ)) قَالُوْا: فَنَحْنُ، قَالَ: ((وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ)) قَالَ: فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَيَّ اِيْمَانًا لَقَوْمٌ يَكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ يَجِدُوْنَ صُحُفًا فِيْهَا كِتَابٌ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِيْهَا))(۱)

اس حدیث کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ ایمان کے افضل ہونے کے علاوہ اس کا ایک پہلو اَعْجَبْ ہونا بھی ہے۔ یہ بات تو عام طور پر ہم سب ہی جانتے ہیں کہ افضلیت وفضیلت کے اعتبار سے اُمت میں سے کسی بڑے سے بڑے ولی کا ایمان بھی اُس صحابی سے افضل نہیں ہوسکتا جس نے حالت ایمان میں نبی اکرم ﷺ کی صحبت مبارکہ چاہے تھوڑی دیر کے لیے اٹھائی ہو۔ مشہور محدث‘ فقیہہ‘ عابد و زاہد اور مجاہد

(۱) رواه البيهقي في دلائل النبوة‘ بحواله مشكوٰة المصابيح‘ كتاب المناقب‘ باب ثواب هذه الامة۔

بالسیف حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ میں سے ان کے نزدیک افضل کون ہے؟ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا چہرہ اس سوال پر تمتما اُٹھا اور انہوں نے فرمایا: ''خدا کی قسم! جس گھوڑے پر بیٹھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جہاد کیا تھا اس گھوڑے کے مُنہ سے نکلنے والا جھاگ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے افضل تھا''۔ پھر شخصیت کے تقابل کا کیا سوال! لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اَعجب ایمان (خوبصورت ترین ایمان' دل آویز اور حسین ترین ایمان) اُن خوش نصیبوں کا ہو گا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت کے بعد' آپؐ کے دورِ سعید اور آپؐ کی صحبت مبارکہ سے محروم ہونے کے باوجود کتاب اللہ پر ایمان لانے کے ذریعے سے آپؐ کی رسالت پر ایمان لائیں گے اور دین کی جملہ باتوں کی تصدیق کریں گے اور ان پر عمل کی کوشش کریں گے۔ اب اس حوالے سے اس معاملے کو سمجھئے کہ افضل جو ہے وہ تقرب بالفرائض ہے اور اَعجب جو ہے وہ تقرب بالنوافل ہے۔

اسی بات کو اب دوسری مثال سے سمجھ لیجیے' اس سے بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ کسی دومنزلہ عمارت کا ذہن میں خیال جمائیے۔ بلند تر منزل کون سی ہے؟ یقیناً دوسری منزل۔ جبکہ اہم تر کون سی ہے؟ یقیناً آپ کا جواب ہوگا' پہلی منزل۔ پہلی منزل کا تصور تو دوسری منزل کے بغیر ممکن ہے' لیکن دوسری منزل کا کوئی تصور پہلی منزل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تعمیر کا سارا دارومدار پہلی منزل کی تعمیر پر ہے' اگرچہ وہ رہے گی نیچے۔ بلند تر منزل بہرحال دوسری منزل ہی ہوگی۔ یہ ہے تقرب بالنوافل کا وہ مقام جس کے بارے میں فرمایا گیا: ''اور جب میرا کوئی بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب چاہتا ہے تو میں بھی اس کو محبوب رکھتا ہوں' اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے' اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اُسے لازماً دیتا ہوں اور اگر وہ

مجھ سے پناہ چاہتا ہے تو اُسے پناہ بھی لازماً دیتا ہوں‘‘۔ یہ ہے بلند تر اور اعلیٰ منزل۔ اونچی یقیناً یہی ہے۔

لیکن پہلی منزل یعنی تقرب بالفرائض والی منزل قائم کیے بغیر اگر کوئی دوسری منزل کے ساز وسامان کی فراہمی میں ہمہ تن مصروف ہے‘ اُسی کے لیے دوڑ دھوپ ہے‘ تو میرے نزدیک یہ ایک فضول اور احمقانہ فعل ہے۔ پہلی منزل کے بغیر دوسری منزل کی تعمیر ناممکنات میں سے ہے‘ کوئی صحیح الدماغ شخص اس بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اوّلیت پہلی منزل ہی کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب ترین یہی منزل ہے: ((وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ)) ’’اور میرا بندہ میری کسی محبوب شے کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہے تو میں نے اس پر جو کچھ فرض کیا ہے اس سے بڑھ کر کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کر سکتا‘‘۔

تصوف کے بعض مسائل کے سلسلے میں ہمارا جو موقف ہے وہ متذکرہ بالا حدیث کی روشنی میں واضح ہو گیا۔ البتہ اس ضمن میں ایک مزید وضاحت بہت ضروری ہے۔

## سلوکِ محمدیؐ میں قرآن کی اہمیت

تصوف کے میدان میں اہم ترین بحث ذکر کی ہے‘ لیکن ہمارا تصورِ ذکر مروّجہ تصورِ ذکر سے مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک اصل ذکر‘ حقیقی ذکر‘ مجسم ذکر‘ مؤثر ترین ذکر قرآن مجید ہے‘ جس کو بھلا دیا گیا‘ جس کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہماری فکری‘ ذہنی اور عملی کج روی اور بے راہ روی کا اصل سبب یہی ہے کہ ذکر اپنے اصل ہدف سے ہٹ گیا ہے ع

آہ وہ تیرِ نیم کش‘ جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

میں نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک اصل ذکر قرآن حکیم ہے۔ اس کے بے شمار شواہد قرآن حکیم سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۃ الحجر میں فرمایا:

﴿وَقَالُوْا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶﴾

’’اور لوگ کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پر الذکر (قرآن مجید) نازل کیا گیا

ہے! تو یقیناً دیوانہ ہے''۔

یہ کفارِ مکہ کا قول قرآن نے بیان کیا ہے۔ اس میں منکرین نے بھی قرآن کو ''ذکر'' کہا ہے' جس کی توثیق اللہ تعالیٰ اسی سورت میں اس طرح فرماتا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹﴾ (الحجر)

''بیشک ہم نے اس الذکر (قرآن مجید) کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

سورۃ النحل میں فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝۴۴﴾

''اور ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف یہ الذکر (قرآن مجید) نازل کیا ہے' تاکہ آپ اس تعلیم کی جو آپ کی طرف لوگوں کے لیے نازل کی گئی ہے' ان کے سامنے توضیح وتشریح کریں اور شاید لوگ خود بھی غور وفکر کریں''۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ الذکر' مجسم ذکر' سرتاسر ذکر قرآن ہے۔ اسے پڑھو' اسے حرزِ جان بناؤ' اسے ذہن میں اتارو' اس کو حفظ کرو۔ اس کی تلاوت کرو جیسا کہ تلاوت کا حق ہے اور اس کے ذریعہ اپنے رات اور دن کو زندہ کرو۔ یہ ہے اصل ذکر۔

اس کے علاوہ نماز کے متعلق فرمایا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴﴾ (طٰہٰ) ''نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے''۔ گویا نماز کا مقصد ذکر ہے۔ اور اس ضمن میں سنت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کیا ہے؟ آنحضور ﷺ کی رات کی نماز کا عالم یہ ہے کہ طویل قیام ہے اور اس میں قرآن کی طویل تلاوت ہے۔ ایک ایک رکعت میں سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء تین طویل ترین سورتوں تک کی تلاوت ہے۔ اس کے علاوہ اذکارِ مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ ہیں۔ لیکن یہ طریقے چھوڑ کر ہم نے ضربیں لگانی سیکھی ہیں' خاص آسن ایجاد کیے ہیں' ہم نے نشست کے خاص انداز نکالے ہیں۔ یہ کہاں سے آئے؟ ان پر عمل کرنے والوں میں جو منصف مزاج لوگ ہیں وہ یہ بات مانتے ہیں کہ یہ طریقے رسول اللہ ﷺ سے منقول و ماثور نہیں ہیں' بلکہ یہ بعد کے لوگوں کے اپنے

اجتہادی اور تجرباتی معاملات ہیں۔لیکن ہمارے لیے اس معاملے میں بھی سنت نبویؐ اورسنت خلفائے راشدین مہدیینؓ ہی کو اختیار کرنے میں عافیت ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ ہم کسی سلوک کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ سلوکِ محمدیﷺ ہے جس پر ہم چلنا چاہتے ہیں۔ہم نے سلوک اورسنت کو جمع کیا ہے۔ہم نے سلوک کے غلط تصورات کو چھوڑا ہے جہاں نچلی منزل کی تعمیر کے بغیر اوپر کی منزل تعمیر کرنے کی کوشش ہوتی ہے' جہاں حمیت دینی اور غیرتِ دینی کا معاملہ خارج از بحث ہو گیا ہے۔ہم نے ان تصورات کو ترک کیا ہے تو علیٰ وجہ البصیرت ترک کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ تصوف کے جو مطلوبہ مقاصد ہیں ان کو ہم نہ مانتے ہوں اور ان کو نہ سمجھتے ہوں۔تصوف کا اصل موضوع تطہیر قلب اور تعمیر سیرت ہے۔ہم علیٰ وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ اس کا اصل منبع وسرچشمہ قرآن حکیم ہے' جو شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ بھی ہے' هُدًى لِّلنَّاسِ بھی ہے' اَلذِّکْر اور اَلذِّکریٰ بھی ہے۔ربیع قلب بھی ہے' نورِ صدر بھی ہے۔ جلاءِ حزن بھی ہے اور ذَهَابِ هَمّ وَغَمّ بھی ہے۔الغرض ہمارے نزدیک تزکیۂ نفس کا اصل ذریعہ ہے قرآن مجید۔اس کا لبّ لباب ہے ایمان' اور ایمان کا لبّ لباب ہے توکل اور راضی بہ رضائے ربّ رہنا۔یہی تصوف کا حاصل ہے ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

کون اس کا انکار کرے گا! معاملہ ذرائع کا ہے۔ہم نے سلوکِ محمدیؐ کو اختیار کیا ہے' جس کا منبع وسرچشمہ قرآن مجید ہے۔

## تصورِ دین میں تبدیلی کے اسباب

سیرت نبویؐ کا مطالعہ کیجیے اور دیکھئے کہ نبی اکرمﷺ کا سلوک کون سا تھا! آپ کو صاف نظر آئے گا کہ اس میں اصل اور بنیادی اہمیت تقرب بالفرائض کی تھی' اور آپؐ فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف تھے۔جبکہ تقرب بالنوافل میں آپؐ جس مقام ومرتبہ پر تھے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔اس معاملے میں ہم کیا

عرض کریں گے! آپ ﷺ نے خود فرمایا: ((وَاَیُّکُمْ مِّثْلِیْ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ)) (۱) ''تم میں سے کون میرے مانند ہوسکتا ہے؟ میں تو رات اپنے ربّ کے پاس بسر کرتا ہوں' وہ مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے''۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ دیکھئے کہ ان کا سلوک کون سا تھا؟ یہ سلوک بالفرائض تھا۔ ان کا سارا زور' ان کی ساری توجہ فرائض پر مرکوز نظر آتی ہے۔ میں جب ''دینی فرائض'' کا ہمہ گیر اور جامع تصور آپ کے سامنے رکھوں گا تو بات مزید واضح ہو جائے گی۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ بعد کے اَدوار میں ان تصوراتِ دینی اور سلوکِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر رفتہ رفتہ مختلف حجابات پڑتے چلے گئے' تا آنکہ یہ دینی تصورات حجابات میں ایسے مستور ہوئے کہ عوام تو عوام خواص کی آنکھوں سے بھی اوجھل ہو گئے۔ اب تو عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دینی فرائض بس نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کی عبادات میں محدود و محصور ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کے بھی چند نمایاں اسباب ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل تو ''اسلام'' بحیثیت دین موجود ہی نہیں تھا۔ موجود ہونا اور نافذ العمل ہونا تو درکنار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین توحید کو خود اُن کے جلیل القدر فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل گم کر چکی تھی اور اس پر مشرکانہ عقائد اور نظریات وتوہمات کا بھرپور غلبہ تھا۔ یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں جو گھر خالص اللہ کی عبادت کے لیے ان باپ بیٹوں نے تعمیر کیا تھا اس بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے جن کی پرستش ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا دین توحید کئی فرقوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ روح اور عمل دونوں اعتبارات سے توحیدِ خالص کا تصور مسخ ہو چکا تھا' حتیٰ کہ ان میں ایک ایسا فرقہ بھی موجود تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا لایا ہوا دین توحید یونان و روم کی اصنام پرستی سے مغلوب ہو کر تثلیث کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ مجوسی آتش پرستی اور ثنویت (یزدان اور اہرمن) کے قائل

(۱) متفق علیہ۔ تفصیلی حوالہ گزر چکا ہے۔

تھے۔الغرض پوری دنیا میں شرک کے اندھیارے چھائے ہوئے تھے۔

اس صورت حال کا تقاضا تھا کہ دین توحید کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ازروئے حکمِ الٰہی:﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ (الشوریٰ:۱۳)''یہ کہ دین کو قائم کرو''۔اس معرکۂ حق و باطل کے لیے خود کو تیار کرنا تھا۔اس کے لیے اپنے قلب و ذہن کو بیدار کرنا تھا اور تقرب الی اللہ کے لیے تقرب بالفرائض کے پہلو بہ پہلو تقرب بالنوافل کو بھی معمولات میں شامل کرنا تھا۔ان دونوں ذرائع سے اپنے فکر ونظر کو نورِ ایمان سے منور اور شوقِ شہادت سے مملو اور معمور کرنا تھا۔چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے جاں نثار ساتھی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہمیں دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں یہی نقشہ نظر آتا ہے۔یہ تھا صحابہ کرامؓ کا سلوک۔اسی کی شہادت قرآن مجید' احادیث شریفہ اور سیرت کی تمام مستند کتب دیتی ہیں۔اسی نقشہ کی علامہ اقبال نے یوں تعبیر کی ہے۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!

البتہ بعد میں جب دین غالب ہو گیا' نہ صرف عرب بلکہ عراق' شام' فلسطین' ایران حتیٰ کہ افریقہ کے شمالی علاقے کے بہت بڑے حصے پر اللہ کے دین کا جھنڈا سربلند ہو گیا اور شریعت کا نفاذ عمل میں آ گیا تو اب منظر یہ تھا کہ اللہ کا حکم چل رہا ہے' اسلامی عدالتیں قائم ہیں' قاضی ہیں' فتاویٰ دیے جا رہے ہیں' شریعت خداوندی کے مطابق فیصلے ہو رہے ہیں۔لہٰذا اب وہ وقت آیا کہ تقرب بالفرائض کے ساتھ ساتھ تقرب بالنوافل کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔چنانچہ اُس دَور میں بھی کثرت کے ساتھ ایسے حضرات نظر آتے ہیں جو تقرب بالفرائض کے ساتھ ساتھ تقرب بالنوافل میں بھی پورا انہماک رکھتے تھے۔تاریخ کی یہ بڑی عجیب اور بڑی پیاری شہادت ہے کہ جب اللہ کے دین توحید کی دعوت وتبلیغ اور نظامِ قسط وعدل کے قیام ونفاذ کے لیے مجاہدین اسلام ایران جیسی وقت کی عظیم ترین قوت سے نبرد آزما ہوئے اور اس کی مضبوط اور عظیم

عسکری قوت ان مٹھی بھر اور ناقص و نامکمل اسلحہ جنگ کے حامل مجاہدین کے ایمان کی آہنی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے لگی تو ایرانی سپہ سالار رستم نے اپنے جاسوس بھیجے کہ معلوم کریں کہ ان بے سروسامان جنگجوؤں کی قوت کا اصل راز کیا ہے' تو اس کے مخبروں اور جاسوسوں نے اسے ان مجاہدین کے بارے میں بتایا: هُمْ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ وَرُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ یعنی دن میں یہ لوگ شہسوار اور مردانِ میدانِ کارزار ہیں اور ان کی راتیں اپنے اللہ کے حضور میں قیام وسجود' گریہ وزاری اور دعا ومناجات میں بسر ہوتی ہیں۔ ان کی داڑھیاں اور ان کی سجدہ گاہیں خشیت الٰہی کے آنسوؤں سے تر ہوتی ہیں ـــــ حالانکہ دنیا جنگ کے جن طور طریقوں سے واقف تھی اور آج بھی آگاہ ہے' وہ تو یہ ہیں کہ فوجیوں کی راتیں شراب وکباب اور شباب سے کھیلنے میں بسر ہوتی ہیں۔ یہ وہ عجوبۂ روزگار' انوکھے اور نرالے اللہ کے سپاہی تھے کہ جن کے متعلق دشمن کے جاسوس یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ رات کے راہب اور دن کے شہسوار ہیں۔ ایسے اولیاء اللہ سے جو بھی کبھی ٹکرایا وہ ریت کے ٹیلوں کی طرح بکھر گیا۔ پس یہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم کا سلوک۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بیت اللہ میں نماز کا ثواب ایک لاکھ گنا اور حرمِ نبویؐ میں پچاس ہزار گنا ہے۔ اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی نمازیں چھوڑ کر جہاد وقتال کے لیے نکلے۔ اس لیے کہ اللہ کے دین کو بالفعل قائم کرنے کی سعی وجہد سب سے بڑا فرضِ منصبی ہے۔ یہ کام حرمِ شریف اور حرمِ نبویؐ میں نمازیں ادا کرنے سے بھی زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے۔ یہ تقرب بالفرائض میں شامل ہے' جس کے بغیر تقرب بالنوافل ممکن ہی نہیں۔

دورِ خلافت راشدہ کے بعد ہمیں اپنے بزرگانِ دین کی اکثریت میں تقرب بالنوافل کثرت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس کی توجیہہ بھی ہے' جواز بھی ہے اور اس کا صحیح مقام ومحل بھی سمجھ میں آتا ہے۔ وہ یہ کہ اُس وقت کی معلوم ومتمدن دنیا کے ایک بہت بڑے خطے پر اللہ کا دین قائم ونافذ ہو چکا تھا' اللہ ہی کا کلمہ اور جھنڈا سربلند تھا' ﴿وَكَلِمَةُ

اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا﴾ کا مشاہدہ دنیا چشمِ سر سے کر رہی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ تقرب بالفرائض کو صرف ارکانِ اسلام میں محدود سمجھنے کا تصور پختہ ہوتا چلا گیا اور تواصی بالحق، دعوت الی اللہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، شہادت علی الناس، اقامت دین کے لیے جدوجہد اور قتال فی سبیل اللہ کو دینی فرائض کی فہرست سے خارج سمجھا جانے لگا، یہاں تک کہ ہمارے دینی نظامِ زندگی کا پورا قصر مسمار ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اسلام بکمال وتمام دنیا کے کسی گوشے میں بھی قائم ونافذ نہیں رہا۔ اب صورتِ حال وہ ہو گئی تھی جس کو مولانا حالی نے بڑی دلسوزی کے ساتھ یوں تعبیر کیا ہے:

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ دینی فرائض کا جامع اور ہمہ گیر تصور اجاگر کیا جاتا اور پورے شدومد سے تقرب بالفرائض پر زور دیا جاتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا، بلکہ سلوک کا جو راستہ (تقرب بالنوافل) تصوف نے متعین کیا تھا یہ قافلہ اُسی پر چلتا رہا۔ وہ ابھی تک اپنی اصل کی طرف لوٹ نہیں رہا، حالانکہ صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔ اب پھر اسی سلوک کی ضرورت ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا۔

## برعظیم پاک وہند میں تجدیدی کوششیں

جن حضرات نے ہندوستان اور خاص طور پر دورِ مغلیہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات یقیناً جانتے ہوں گے کہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ہندوستان میں حکومتی سطح پر خرابیاں تھیں، فسق وفجور بھی تھا، اکبر کا دین الٰہی بھی آ گیا تھا، لیکن شریعت کا ڈھانچہ موجود تھا، شرعی عدالتیں قائم تھیں، قاضی موجود تھے۔ چنانچہ حضرت مجدّد الف ثانی نے تلوار نہیں اٹھائی، لیکن سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے احیاء کے لیے صوفیاء کے حلقوں میں سے جس بزرگ ہستی کی طرف سے پہلی مرتبہ کوئی زوردار دعوت اٹھی تو وہ شخصیت تھی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اس کے بعد

جب انگریز آ گیا اور ہمارے نظام کی پوری عمارت ہی زمین بوس ہوگئی تو اب ایک اور احمد اٹھا' اور یہ سید احمد بریلوی ؒ تھے۔ یہ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے جہاد وقتال کا نعرہ لگایا۔ (۱) انہوں نے کہا کہ ہمارا سلسلہ ''سلوکِ محمدیہ'' ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ سلوک کے چار مشہور سلاسل ہیں: سلسلۂ قادریہ' سلسلۂ نقشبندیہ' سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ سہروردیہ۔ انہوںؒ نے نہایت زور دے کر کہا کہ ہمارا طریقہ اور سلوک وہ ہے جس میں جنگ اور قتال فی سبیل اللہ ہے' جس میں اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جانا ہے۔ یہ طریق و سلوکِ محمدیہؐ ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔ اُسی کی طرف ہم دعوت دے رہے ہیں اور اسی پر ہم عمل پیرا ہیں۔ اور اس سلسلۂ محمدیہ کا ذکرِ اوّلین ہے قرآن مجید۔

اسی تصور کو ہم نے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کیا ہے جو سید احمد بریلوی شہیدؒ کے بقول طریق وسلوک محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ تقرب الی اللہ کا ہمارا جو تصور ہے' طریقت اور سلوک کے بارے میں ہمارے جو نظریات ہیں' ہمارے نزدیک تقرب الی اللہ کے جو وسائل اور ذرائع ہیں' ان میں جو نسبت و تناسب ہے ان امور کے بارے میں مَیں نے اپنی امکانی حد تک وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور مجھے توقع ہے کہ ہمارا موقف آپ حضرات کے سامنے آ گیا ہوگا۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ آپ اس سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں۔

ہماری اب تک کی گفتگو اِس سوالیہ نشان تک پہنچ گئی ہے کہ ''از روئے قرآن حکیم ہمارے بنیادی دینی فرائض کیا ہیں؟'' اس کے ساتھ ہی مجھے اس امر کی بھی وضاحت کرنی ہے کہ ''آیا اِن کی ادائیگی انفرادی طور پر ممکن ہے یا نہیں''؟ آپ ایک درخت کا

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی کتاب ''پرانے چراغ'' میں ولی اللّٰہی حکمت کے متعلق یہ شعر نظر سے گزرا۔

یہی ہے مختصراً حکمت ولی اللہ
جسے تو مدرسہ و خانقاہ اٹھے تو سپاہ (جمیل الرحمٰن)

تصور کیجیے۔ اس کی ایک جڑ اور ایک تنا ہے۔ پھر اس سے چار شاخیں نکلی ہوئی ہیں جن سے مزید بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں اور پھر پتے ہیں۔ الغرض شاخوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ یہی مثال اپنے دین اسلام کی سمجھئے۔ ساتھ ہی یہ بھی جان لیجیے کہ ''فرض'' کا تصور آپ کو ہر سطح (level) پر ملے گا۔ انسان کا سب سے پہلا اور بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بنے۔ یہ اس درخت کا تنا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ (البقرۃ:۲۱) اس سے آگے یہ مطالبہ آئے گا کہ نماز بھی پڑھیں' وہ بھی فرض ہے۔ یہ تنے سے شاخیں پھوٹ رہی ہیں۔ پھر نمازوں میں کچھ فرائض ہیں' کچھ سنتیں ہیں۔ اب ایک شاخ سے بہت سی شاخیں پھوٹ گئیں۔ آپ نے چار رکعت کی نیت کی۔ اب اس میں بھی کچھ فرائض ہیں۔ اس میں قیام اور قراءت فرض ہے' رکوع و سجود فرض ہے۔ تو یہ فرض یہاں سے وہاں تک چل رہا ہے۔ اسی طرح جن نمازوں کو ہم سنتیں یا نوافل کہتے ہیں' ان میں بھی یہی فرائض موجود ہیں۔ فرائض کا بنیادی تصور اور پھر فرائض کا ثانوی تصور اگر ترتیب کے ساتھ نہیں سمجھیں گے تو ذہن کے اندر ایک الجھاؤ اور انتشار (confusion) رہے گا۔

## ہمارا بنیادی فرض ـــــ ''عبادتِ ربّ''

فرائض کے بارے میں ہمارے ہاں عمومی تصور یہ ہے کہ نماز پڑھ لی' فرض ادا ہو گیا۔ روزہ رکھ لیا' فرض ادا ہو گیا۔ صاحب نصاب ہیں تو زکوٰۃ ادا کر دی' صاحبِ استطاعت ہیں تو حج کر لیا' یہ دونوں فرائض بھی ادا ہو گئے۔ اب اور کون سے فرائض ہیں' جن کی ادائیگی کا مطالبہ ہے؟ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں'' کے مصداق آپ بنیادی فرائض کو اگر ایک لفظ میں سمجھنا چاہیں تو وہ ہے ''عبادتِ ربّ''' یعنی اللہ کے بندے بننا۔ (۱)

اسی بات کو واضح کرنے کے لیے قرآن مجید میں دو اصطلاحات اور آتی ہیں۔

(۱) اس موضوع پر تفصیلی معلومات کے لیے محترم ڈاکٹر صاحب کی تالیف ''مطالباتِ دین'' کا مطالعہ ان شاء اللہ مفید مطلب ہوگا۔ (مرتب)

ایک ہے: اَطِیْعُوا اللّٰہَ ''اللہ کی اطاعت کرو'' اور دوسری ہے: اَسْلِمُوْا ''سرِ تسلیم خم کرو''۔ مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اللہ کے بندے بنو' اس کی غلامی اختیار کرو' بندگی کی روش اختیار کرو' اطاعت کرو' گردن جھکا دو' سرِ تسلیم خم کر دو' فرماں برداری کا وطیرہ اپناؤ۔ ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ چنانچہ پہلا فرض جو سارے فرائض کی جڑ اور بنیاد ہے' وہ ہے ''عبادتِ ربّ''۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں' بڑا کٹھن ہے۔ اس راہ میں بڑے بڑے موانع ہیں۔ سب سے پہلا مانع ہمارا اپنا نفس ہے۔

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیک اُو را عون ایں را عون نیست!

نفس نہیں مانتا' خواہشاتِ نفس اس راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ پھر ماحول رکاوٹ بنتا ہے۔ خود اپنے بیوی بچے آڑے آتے ہیں۔ برادری نہیں مانتی' رشتہ دار نہیں مانتے۔ اس طرح یکے بعد دیگرے موانع کے کئی دائرے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک سے نبرد آزما ہونا ہے۔

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را!

عبادتِ ربّ کے ضمن میں ایک بات اچھی طرح واضح رہنی چاہیے کہ عبادت اور بندگی کلی طور پر مطلوب ہے' جزوی مطلوب نہیں ہے۔ غلام تو ہمہ وقت غلام ہوتا ہے' جبکہ ملازمت ایک جزوی معاملہ ہوتا ہے۔ عبدیت تو ہمہ تن اور ہمہ وقت بندگی کا نام ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ص﴾ (البقرۃ:۲۰۸) ''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!'' اپنے پورے وجود' اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں سمیت اسلام میں داخل ہونا پڑے گا۔ اپنے نفس کی تمام خواہشات کو اللہ کی فرماں برداری کا خوگر بنانا ہوگا۔ یہاں اگر ایک حکم بھی جان بوجھ کر سرکشی کے جذبے کے تحت توڑا اور اس پر اصرار کیا تو یہ ایک نافرمانی سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دے گی۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾﴾ (البقرۃ)

''کیوں نہیں! جس کسی نے (اپنے دلی ارادے کے ساتھ) ایک برائی کمائی اور اس کی خطا کاری نے اس کو گھیرے میں لے لیا تو یہی لوگ دوزخی ہیں' وہ اُسی میں ہمیشہ رہیں گے''۔

دین میں جزوی اطاعت نہیں' کلی اطاعت درکار ہے۔ جزوی اطاعت پر تو قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے غیظ وغضب کا اظہار فرمایا ہے:

﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ اُن حرکات سے بےخبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو''۔

اس آیت کے تیور پہچانیے۔ اس میں کس قدر غیظ وغضب کا اظہار ہو رہا ہے کہ یہ کیا روش ہے اور یہ کیا اطاعت ہے کہ تم کتاب کی کچھ باتیں مانتے ہو اور کچھ نہیں مانتے؟ یہ حکم ہمارا تھا' یہ سر آنکھوں پر! اور وہ حکم بھی ہمارا تھا' اُسے پاؤں تلے روند دیا! اس ڈھٹائی اور اس گستاخی کی سزا یہی ہے کہ دنیا میں تم کو ذلیل ورسوا کر کے رکھ دیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔ اور اس غرّے میں نہ رہنا کہ تم اللہ کو دھوکہ دے لو گے اور وہاں بھی تمہارا فریب چل جائے گا۔ جان لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے بےخبر نہیں ہے۔

اس آیت کے اصل مخاطب یہود ہیں اور اس میں ان کے اس عظیم ترین جرم کا ذکر ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین وشریعت کے ساتھ روا رکھا تھا۔ لیکن قرآن کا

یہ اسلوب ہے کہ اُمم سابقہ کے حالات و واقعات' ان کی بداعمالیاں' ان کے کرتوت اوران کے نتیجے میں وہ دنیا میں جس انجامِ بد سے دوچار ہوئے' اس کا ذکر سبق آموزی اورعبرت پذیری اور اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے انتباہ کے لیے بھی ہوتا ہے کہ دیکھنا نافرمانی اور سرکشی کی وہ روش اور طرزِ عمل اختیار نہ کرنا جو مغضوب وضال اُمم نے اختیار کیا تھا۔ اگر تم نے بھی وہی کچھ کیا جو انہوں نے کیا تھا تو ہمارا قانون بے لاگ ہے' ہماری سنت اٹل ہے۔

﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾﴾ (فاطر)

''پس (یہی بات ہے تو) تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے' اور تم اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے پھرا ہوا ہرگز نہ پاؤ گے''۔

تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ سلوک ہوگا جو نافرمان اور سرکش امِم سابقہ کے ساتھ ہو چکا ہے۔

عبادتِ ربّ وہ فریضہ ہے جس کے لیے ہماری تخلیق ہوئی۔ سورۃ الذّٰریٰت میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾﴾

''اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں''۔

تمام انبیاء ورُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام اسی دعوت اور اسی پکار کے ساتھ مبعوث ہوئے:

﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾ (الاعراف:۵۹'۶۵'۷۳'۸۵)

''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو' اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔''

اور:

﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٣﴾﴾ (نوح)

''یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو اور میری اطاعت کرو۔''

قرآن مجید بھی آیا تو یہی دعوت اور پکار لیے ہوئے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾﴾ (البقرۃ)

''اے بنی نوع انسان! اپنے اُس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو بھی' تا کہ تم بچ سکو۔''

تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کی اُمتوں کو یہی حکم دیا گیا کہ وہ ہر طرف سے مُنہ موڑ کر اور یکسو ہو کر صرف اللہ کی بندگی کریں اور اپنی اطاعت کو اسی کے لیے خالص کریں۔

از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ﴾ (البیّنۃ:۵)

''اور ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ بندگی کریں اللہ کی' اُس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے' (ابراہیمؑ کی طرح) یکسو ہو کر''۔

## عبادت کا جزوِ لازم-دُعا

عبادت کے ضمن میں ایک انتہائی اہم شے ''دعا'' ہے' جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا جوہر بھی قرار دیا ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (۱) اور یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ دعا ہی اصل عبادت ہے: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (۲)۔

قرآن مجید نے اس کی طرف ان الفاظ میں دعوت دی ہے کہ:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝﴾ (المؤمن)

''اور تمہارا ربّ فرماتا ہے کہ مجھ ہی کو پکارو (مجھ ہی سے مانگو) میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا' بے شک جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے مُنہ موڑتے ہیں وہ عنقریب ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے''۔

سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۲۳) میں ایک قاعدہ کلیہ اور اٹل فیصلے کے طور پر فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾

''آپ کے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب منه۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن' باب ومن سورة المؤمن۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب الدعاء۔

اُسی کی‘‘۔

الغرض عبادتِ ربّ کی دعوت قرآن حکیم کا اصل موضوعِ خطاب ہے۔

## عبادتِ ربّ کے دو تقاضے

اس عبادتِ ربّ سے دو چیزیں اور نکلتی ہیں۔ اگر عبادت صحیح رُخ پر ہے‘ دھوکہ اور فریب نہیں ہے‘ جزوی نہیں‘ کلی ہے تو جب آپ اللہ کے بندے بنیں گے تو آپ کی شخصیت سے عبادتِ ربّ کی ایک خاموش تبلیغ خود بخود شروع ہو جائے گی۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں‘ لوگ اُسے دیکھ رہے ہیں۔ لوگوں کے دل میں آپ سے آپ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص ایسا کیوں کر رہا ہے! اس نے یہ کام کیوں کیا؟ چنانچہ کوئی شخص اس لیے نقصان اٹھالے کہ وہ اللہ کی بندگی کا دعوے دار ہے اور وہ بڑے سے بڑے فائدے کے راستے کو صرف اس لیے اختیار نہ کرے کہ اس میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے تو یہ ہے اصل اور حقیقی تبلیغ۔ کوئی بندۂ مؤمن دین کی خاطر زمانے کے غیر اسلامی چلن کو چھوڑ کر خطرات مول لے‘ مالی نقصانات انگیز کرے‘ استہزاء گوارا کرے تو ماحول پر اس کے وہ اثرات مترتب ہوتے ہیں جو خالی خولی وعظوں سے نہیں ہو سکتے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ شخص یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے جذبے سے کر رہا ہے‘ اللہ کے حکم کے مطابق کر رہا ہے تو ان کے جو احساسات ہوں گے‘ ان کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس سے بڑی تبلیغ کوئی ہے ہی نہیں‘ چاہے آپ نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا ہو۔

پھر اگر شرافت و مرّوت ہے تو جو چیز آپ نے اپنے لیے پسند کی ہے تو کیا وہی چیز آپ اپنے بھائی کے لیے پسند نہیں کریں گے؟ اگر غیرت و حمیت ہے تو اللہ کے دین کے خلاف جو عمل آپ کو نظر آئے گا اس پر آپ کے خون میں جوش نہیں آئے گا؟ آپ کی غیرت بھڑکے گی نہیں؟ یہ سارے تقاضے ہیں جو عبادت ربّ کا راستہ اختیار کرنے سے اُبھرتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ‘ نصیحت و تلقین‘ امر بالمعروف و نہی عن المنکر‘ یہ سب برگ و بار اور ثمرات عبادتِ ربّ کے شجرۂ طیبہ سے آپ سے آپ پھوٹیں گے۔ خود ہی

غور کیجیے کہ اگر آپ اللہ کا بندہ بننا چاہتے ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے جب تک آپ اپنے اردگرد بندگیٔ ربّ کا ایک ماحول پیدا نہ کریں! آپ اپنے گھر میں بھی اللہ کے بندے نہیں بن سکتے جب تک پورے گھر میں بندگیٔ ربّ کی چھاپ موجود نہ ہو۔ بیوی بھی اللہ کی بندی ہو‘ اولاد بھی اللہ کی بندگی کو اختیار کیے ہوئے ہو تو گھر میں بندگیٔ ربّ کا ماحول بنے گا۔ اس سے آگے آپ کے لیے ضروری ہوگا کہ محلے میں بندگیٔ ربّ کا ماحول پیدا کر دیں‘ ورنہ آپ کا بچہ باہر نکلے گا تو گالی سیکھ کر آئے گا‘ وہ خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی سیکھ کر آئے گا۔ آپ اسے کسی تہہ خانے میں بند کر کے تو نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ اگر آپ فی الواقع بتمام وکمال خود اللہ کا بندہ بننا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے محلے میں‘ اپنی آبادی میں‘ اپنے شہر میں‘ اپنے ملک میں اور پھر پوری دنیا میں عبادتِ ربّ کا نظام قائم کرنا ہوگا۔

## عبادتِ ربّ کا لازمی تقاضا- ’’اقامت دین‘‘

اس طرح عبادتِ ربّ ہی کے لازمی تقاضے کے طور پر ہمارے سامنے دین کا یہ مطالبہ آتا ہے: ((اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ)) (الشوریٰ:۱۳) ’’یہ کہ دین کو قائم کرو‘‘۔ یہ فریضۂ اقامت دین ہے۔ ماحول پر بندگیٔ ربّ قائم ہوگئی تو دین قائم ہوگیا۔ چنانچہ اپنے گھر پر دین قائم کرو‘ اپنے محلے اور بستی میں دین قائم کرو‘ اپنے شہر اور ملک میں دین قائم کرو۔ پھر دین کی آفاقی دعوت کے علمبردار بن کر پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے قیام و نفاذ کے لیے جدوجہد کرو۔ سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ﴾ (آیت ۴۰)

’’فرماں روائی اور حکمرانی کا اقتدار و اختیار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے‘ اُس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو‘ یہی دینِ قیم ہے‘‘۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس آیت میں عبادتِ ربّ کے حکم سے پہلے یہ بات واضح کر دی گئی کہ حاکمیت (sovereignty) صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

اور جب پورا نظامِ زندگی اللہ کی حاکمیت کے تصور پر قائم ہو تو اسی کا نام ہے ''الدین القیم''۔

## لفظ دین کا حقیقی مفہوم

دین کا اصل مفہوم ''جزا و سزا'' اور ''بدلہ'' ہے۔ اس بنیادی تصور کے تمام مقتضیات اور لوازم کے اجتماع سے قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح ''الدّین'' بنی ہے۔ چنانچہ دین کے معنی ہیں ایک پورا نظامِ زندگی' مکمل ضابطۂ حیات اور اکمل واتم دستور و آئینِ اطاعت' جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع' مقنن (Law Giver) اور حاکمِ مطلق (Absolute Sovereign) مان کر اس کی سزا کے خوف اور اس کے انعام کے ذوق وشوق سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ قانون اور ضابطے کے مطابق اس ہستی یا ادارے کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے۔ پس اقامت دین کا حکم عبادتِ ربّ ہی کے اس عہد کا تقاضا ہے کہ جس کی ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں تجدید کرتے ہیں کہ ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' یعنی ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے۔ چنانچہ لازم ہے کہ ہم خود بھی حقیقی معنوں میں اللہ کے بندے بنیں اور ساتھ ہی ہم اپنے گھر پر' اپنے محلے اور بستی پر' اپنے شہر اور ملک پر اور پھر کُل روئے زمین پر عبادتِ ربّ کا نظام یا بالفاظِ دیگر دین الحق کو قائم' غالب اور نافذ کرنے کی سعی و کوشش کریں۔ اسی کے لیے محنت ہو' اسی کے لیے تگ و دَو ہو' اسی کے لیے بھاگ دوڑ ہو' اسی کے لیے سونا ہو' اسی کے لیے اٹھنا ہو' اسی کے لیے بیٹھنا ہو' اسی کے لیے جینا اور مرنا ہو' اسی کے لیے لوگوں سے جا کر ملنا ہو' اسی کے لیے اپنے ذہن وفکر کی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہو' اسی کے لیے جسم و جان کی توانائیوں کو کھپانا اور اسی کے لیے سوچ بچار کرنا ہو۔ یہ ساری چیزیں عبادتِ ربّ میں شامل ہیں۔ یہی سنت رسول ﷺ ہے اور یہی تقرب الی اللہ بالفرائض ہے۔ تینوں باتیں ایک ہی ہیں۔ اور یہی ہے سلوکِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔

## آنحضورﷺ کے اُمتی ہونے کے لوازم

مسلمان ہونے کے اعتبار سے ہماری دو نسبتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہم اللہ کے بندے ہیں اور دوسری یہ کہ ہم محمدؐ رسول اللہﷺ کے اُمتی ہیں۔ اب تک میں نے عبادتِ ربّ کے ضمن میں چند چیزیں آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ دعوت، تبلیغ، تلقین، نصیحت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ دین کو اپنے گھر، اپنے محلے، شہر، ملک اور پوری دنیا میں قائم کرنے کی جدوجہد، یہ سب عبادتِ ربّ ہی کے تقاضے ہیں۔ اب آیئے غور کریں کہ محمدﷺ کے اُمتی ہونے کے اعتبار سے ہمارے فرائض اور ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ آنحضورﷺ کے اُمتی ہونے کی وجہ سے اس میں ایک مزید رُخ (dimension) اور پہلو (aspect) کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو اپنے طور پر بندگیٔ ربّ کے تقاضے کے طور پر یہ کام کر رہا ہے اور ایک وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ مامور فرما دے کہ تجھے کرنا ہی یہ کام ہے۔ اب معاملہ بہت بلند اور ارفع ہو گیا۔ جناب محمدﷺ اللہ کے بندے بھی ہیں اور رسول بھی ہیں۔ نَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ـــــ نوعِ انسانی کے لیے نصح و خیر خواہی اور اس کی نجات کے لیے فکرمند اور متمنی ہونا آپﷺ کی عبدیت کا بھی تقاضا تھا، جبکہ رسول ہونے کی حیثیت سے آپؐ اس کام پر مامور من اللہ ہو گئے، اب آپؐ ایک ایک شخص کے پیچھے جایئے، ایک ایک کے گھر پر دستک دیجیے، ایک ایک کے دل پر جا کر صدا لگایئے۔ آپؐ کا معاملہ عام اولیاء اللہ والا نہیں ہے۔ آپؐ کو جب رسول بنا کر مامور کیا گیا ہے تو آپؐ کی ذمہ داری سوا ہو گئی ہے۔

## ہر اُمتی ''رسول'' ہے

ہمارا ایمان ہے کہ نبوت و رسالت محمدؐ رسول اللہﷺ پر اختتام کو پہنچی اور اکمال و اتمام کو بھی۔ اب کارِ رسالت کی ذمہ داری اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر بحیثیت اُمت عائد کر دی گئی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں اُمت وسط (بہترین گروہ) بنایا ہے تاکہ تم (دنیا کے) لوگوں پر گواہی دینے والے بن جاؤ اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔''

مزید فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ (الحج:۷۸)

''اور (اے ایمان لانے والو!) اللہ کے لیے جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں (اپنے اس کام کے لیے) چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اس نے پہلے بھی تمہارا نام ''مسلم'' رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ تم پر گواہ ہو جائیں رسول اور تم لوگوں (بنی نوع انسان) پر گواہی دینے والے بن جاؤ''۔

ایک مقام پر فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''تم (دنیا میں اب) بہترین اُمت ہو جسے لوگوں (کی رہنمائی اور ہدایت و اصلاح) کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

یہ تمام آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ختم نبوت و رسالت کے بعد کارِ رسالت کی ذمہ داری یعنی نوعِ انسانی پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دینا، جیسے آنحضرت ﷺ نے اُمت پر دی، اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کاندھوں

پر عائد کر دی گئی ہے۔ گویا اب اُمت محمد ﷺ کا ایک ایک فرد ''رسول'' ہے۔

جن لوگوں نے اناجیل کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے دیکھا ہوگا کہ ان میں ایک مستقل باب ہے ''رسولوں کے افعال'' (Acts of the Apostles)۔ یہ رسول (apostles) کون ہیں؟ یہ تھے حواریینِ حضرت مسیح علیہ السلام۔ البتہ ان کا تصور ہمارے تصور سے مختلف ہے۔ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ قرار دے کر الوہیت کے مقام پر پہنچایا تو اُن کے شاگردوں کو باقاعدہ رسول بنا دیا۔ اس طرح انہوں نے ان کو ایک درجہ اونچا اٹھا دیا۔ ہمارا تصور یہ ہے کہ اللہ نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو۔ رسول اللہ ﷺ نے اُمتیوں کو اسی کام کے لیے لوگوں کی طرف بھیجا کہ جاؤ لوگوں تک یہ دعوت پہنچاؤ' اس کی تبلیغ کرو۔ مثلاً آنحضور ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی۔ دارِ ارقم میں آنجنابؐ کی مجلس میں چند صحابہ کرامؓ حاضر ہوتے تھے۔ وہ آنحضرتؐ سے نازل شدہ وحی سیکھتے اور مکہ میں ان لوگوں کو پہنچا دیتے جو ایمان لا چکے تھے' لیکن ہمہ وقت صحبت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حاضر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ اصحابِ رسولؐ گویا ایک طرح پیغامِ وحی پہنچانے کے لیے ''پیغامبر'' کا فریضہ انجام دیتے تھے اور اس طرح کارِ رسالت میں آنحضرت ﷺ کے ''رسول'' تھے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۱ نبوی میں بارہ اشخاص یثرب (مدینہ منورہ) سے آئے اور بیعتِ عقبہ اولیٰ ہوئی۔ اس موقع پر ان حضراتؓ نے نبی اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی ایسا شخص دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھائے اور احکامِ اسلام سکھلائے۔ آنحضور ﷺ نے اس خدمت کے لیے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا۔ وہ اللہ کے رسولؐ کے فرستادہ یعنی ''اللہ کے رسولؐ کے رسول'' تھے۔ اس معنی میں ہر اُمتی اللہ کے رسول ﷺ کا رسول ہے۔ ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے جب ایران پر یلغار کا سبب معلوم کیا تھا تو اس کے جواب میں حضرت سعدؓ نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے:

اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ اِلٰى نُوْرِ الْاِيْمَانِ وَمِنْ

جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ

''بلاشبہ ہم بھیجے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نورِ ایمان کی طرف اور بادشاہوں کے ظلم وستم سے عدلِ اسلام کی طرف نکالیں''۔

اس میں لفظ ''اُرْسِلْنَا'' خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ حضرت سعدؓ صاف بتا رہے ہیں کہ ''ہم خود نہیں آئے' بھیجے گئے ہیں'' اور بھیجنے والے کون ہیں؟ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ! یہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ ایمان سے بہرہ مند کرنے اور ملوک و سلاطین کے پنجۂ جور وستم سے نجات دلا کر اسلام کے نظامِ عدل و انصاف سے مستفید کرنے کے لیے بھیجے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ ہیں رسول اللہ ﷺ کے رسول' آنحضرت ﷺ کے فرستادہ۔ یہ ہیں وہ نفوسِ قدسیہ جو سلوکِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی ارفع اور بلندترین منزلیں طے کرنے کی خاطر میدانِ قتال میں جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلے تھے۔

خلافت راشدہ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسی کارِ رسالت محمد ﷺ کی انجام دہی اور نبی اکرم ﷺ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر نکلے تھے۔ وہ اس لیے نکلے تھے کہ حجۃ الوداع میں دین متین کی اہم تعلیمات کی تذکیر' حقوقِ انسانی کا ایک منشور اور ہدایاتِ ربّانی کا ایک خلاصہ پیش فرمانے کے بعد آنحضور ﷺ نے کمالِ حکمت کے ساتھ شہادت علی الناس [1] اور دعوت وتبلیغ دین حق کی ذمہ داری اُمت کی طرف اس طرح منتقل فرما دی کہ خطبے کے آخر میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجمع سے دریافت فرمایا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) ''لوگو! میں نے (خدا کا پیغام) تم تک پہنچا دیا کہ نہیں؟'' آنحضرت ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ دریافت فرمائی اور صحابہؓ نے تینوں مرتبہ جواب دیا: ''جی ہاں!'' صحیح مسلم کی روایت میں صحابہ کرامؓ کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ [2] ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ نے (خدا کا پیغام) پہنچا دیا' حقِ امانت اور حقِ نصح و

(۱) تفصیل کے لیے ڈاکٹر صاحب کی تالیف ''مطالباتِ دین'' کا مطالعہ مفید مطلب ہوگا۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجة النبی ﷺ۔

خیر خواہی ادا فرمایا''۔اس کے بعد آنحضورﷺ نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع کی طرف اشارہ کر کے تین مرتبہ ارشاد فرمایا:((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ)) ''اے اللہ تو بھی گواہ رہ!'' پھر دعوت و تبلیغ اور کارِ رسالت کی ذمہ داری اُمت کی طرف یہ ہدایت دے کر منتقل فرما دی کہ: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) (۱) ''پس اب جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ اُن تک پہنچائیں جو یہاں نہیں ہیں''۔

## ختم نبوت کا لازمی تقاضا

یہ ختم نبوت و رسالت کا لازمی نتیجہ ہے کہ اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اجتماعی طور پر کارِ رسالت کی انجام دہی پر مامور کی گئی ہے اور اُمت مرحومہ کا ہر فرد دعوت و تبلیغ، شہادت علی الناس اور اقامت دین کی جدوجہد کے لیے مامور ہے اور وہ رسول اللہﷺ کا رسول ہے۔آنحضورﷺ نے یہ فرما کر ہر اُمتی کے لیے کارِ رسالت کی انجام دہی میں آسانی پیدا فرما دی ہے کہ:((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) (۲) ''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ''۔شخصاً رسالت ختم ہوگئی، تاہم اُمت کی حیثیت سے اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فریضۂ رسالت کی ادائیگی پر مامور ہوگئی۔یہ ہے نبی اکرمﷺ کے امتی ہونے کے اعتبار سے ہماری ذمہ داری کا دوسرا رُخ۔چنانچہ ہر اُمتی پر لازم ہے، واجب ہے، فرض ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ، تلقین و نصیحت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے اپنے جان و مال کو لگائے اور کھپائے۔جس طرح رسول اللہﷺ نے تیئیس سالہ مسلسل محنت شاقہ اور جاں گسل مساعی کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کے دین کو عملاً قائم و نافذ کیا ویسے ہی اب اُمت کے ذمہ ہے کہ وہ پورے روئے زمین پر اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنے کی جدوجہد کرے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

یہ ہیں از روئے قرآن ہمارے فرائضِ دینی۔ ہم جن فرائض (نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج) سے واقف ہیں' وہ اسلام کے ارکان ہیں اور عبادت کے ہمہ گیر تصور کا جزوِ لاینفک ہیں' لیکن ہمیں تو پوری زندگی عبادتِ ربّ میں بسر کرنی ہے' لہٰذا عبادتِ ربّ ہی کے تقاضے کے طور پر مذکورہ بالا تمام امور ہمارے دینی فرائض میں شامل ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ فرائض دینی کا جو اصل اور حقیقی تصور ہے وہ بدل گیا ہے اور فرض عبادات (نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج) ہی کو کُل عبادت سمجھ لیا گیا ہے۔ اس طرح اصل اور بنیادی فرائض یعنی عبادتِ ربّ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کا تصور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ حالانکہ بات بالکل سیدھی' صاف اور آفتاب کی طرح روشن ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ اس کی دعوت وتبلیغ اور اس کو کُل جنس دین یعنی نظام ہائے اطاعت پر غالب کرنا ﴿لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ اصلاً فرضِ منصبی ہے رسول اللہ ﷺ کا۔ چنانچہ آپؐ کو حکم ہوا: ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ (المدثّر) اب جو لوگ اللہ اور رسولؐ پر ایمان کے مدعی اور دعوے دار ہوں اُن کے خلوص و اخلاص کا اصل امتحان اور اصل کسوٹی یہ ہے کہ اگر اپنا تن من اس کام میں کھپا دیں اور اللہ اور رسولؐ دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کر لیں ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ﴾ تو کامیاب و کامران' ورنہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد قرار پائیں گے۔

یہ ختم نبوت و رسالت کا ایک لازمی و لابدی تقاضا ہے کہ جو فرائضِ منصبی آنحضور ﷺ کے تھے آپؐ کے بعد اب وہ سب کے سب آپؐ کی اُمت کے ذمے ہیں۔ گویا خواہ دعوت وتبلیغ' انذار وتبشیر' تعلیم وتربیت اور اصلاح وتزکیہ ہو جو بعثتِ انبیاء و رُسل کی غرضِ اصلی اور غایتِ اولیٰ رہی ہے' خواہ اعلاءِ کلمۃ اللہ' شہادت علی الناس' اقامتِ دین اور اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ ہو جو بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مقصدِ امتیازی اور منتہائے خصوصی ہے' یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر

عائد ہوتے ہیں جو النبی الخاتم، رسولِ کامل واکمل جناب محمد ﷺ کے اُمتی ہونے کے مدعی ہیں اور جو آپؐ کے نامِ نامی اسمِ گرامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے اور آپؐ کی اُمت میں ہونے کو موجب سعادت سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ آنحضور ﷺ آخری نبی و رسول ہیں اور آپؐ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں۔ ایک اپنے زمانے کے اہل عرب کی جانب اور دوسری تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی جانب۔ (۱) از روئے آیاتِ قرآنی: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (الجمعۃ:۲)، ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸) اور ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝۱۰۷﴾ (الانبیاء) نبی و رسولِ آخر الزمان ﷺ کا مشن زندہ ہے، تابندہ ہے اور تا قیامِ قیامت زندہ رہے گا۔ اب حضورؐ کے ہر اُمتی کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ وہ کارِ رسالت کے اس تسلسل کو جاری وساری رکھے اور اس راہ میں اپنی جان، اپنا مال اور اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں کو کھپا دینے کو اپنا فرضِ عین سمجھے اور اس کو اپنے لیے سعادت متصور کرے ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

## التزامِ جماعت کی ضرورت واہمیت

اب سوال یہ ہے کہ ان فرائض دینی سے عہدہ برآ ہونا کیا واقعتاً انفرادی طور پر ممکن ہے؟ اس سوال پر نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے غور کیجیے۔ تقرب بالنوافل یقیناً انفرادی طور پر ہی ہوگا، اس میں اجتماعیت نہیں ہوگی۔ احناف کے نزدیک نفل نماز باجماعت (استثنائی حالات مثلاً تراویح وغیرہ کے علاوہ) پڑھنا مکروہ ہے۔ لیکن غور کیجیے کہ کیا تقرب بالفرائض انفرادی حیثیت میں ممکن ہے؟ فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی اور اقامتِ دین کی جدوجہد انفرادی اعتبار سے ممکن ہے؟

(۱) اس مسئلے کی شرح وبسط سے تفہیم کے لیے ڈاکٹر صاحب کی تالیفات ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' اور ''دعوت الی اللہ'' کا مطالعہ ان شاء اللہ مفید رہے گا۔ (مرتب)

اگر فی الواقع تقرب بالفرائض انفرادی طور پر ممکن ہوتا اور اگر دین کا قیام و اظہار، غلبہ اور نفاذ انفرادی طور پر ممکن ہوتا تو اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ضرور ہو جاتا جن کے ساتھ ایک دوسرے پیغمبر حضرت ہارون علیہ السلام بھی موجود تھے۔ لیکن اُمت نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور برملا کہہ دیا کہ ہم قتال نہیں کریں گے۔ حالانکہ حضرت موسیٰؑ نے ان کو بشارت دی تھی کہ ''ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے''۔ لیکن ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ:

﴿قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ (المائدۃ)

''انہوں نے کہا: اے موسیٰ! وہاں تو زبردست لوگ رہتے ہیں، ہاں اگر وہ وہاں سے نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں۔''

ان میں کے دو مؤمنین صادقین نے ان کو اللہ پر توکل رکھنے کی تلقین کی اور فتح کی یقین دہانی کرائی، لیکن قوم ٹس سے مس نہیں ہوئی اور اللہ کے پیغمبرؑ کے روبرو بڑی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

﴿قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (المائدۃ)

''انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم تو وہاں ہرگز اور کبھی نہیں جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا ربّ دونوں جاؤ اور لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے ڈھٹائی پر مبنی اس کورے جواب اور نافرمانی کے اس طرزِ عمل سے اتنے آزردہ اور دل گرفتہ ہوئے کہ دعا کی:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾﴾ (المائدۃ)

''(حضرت موسیٰؑ نے) کہا: اے میرے ربّ! میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر میری اپنی ذات اور میرا بھائی، پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے''۔

رسول اپنی مرضی سے اپنی قوم سے علیحدہ نہیں ہوسکتا' اس لیے حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے التجا کر رہے ہیں کہ قوم کے اور اُن کے درمیان تفریق فرما دے۔ قوم کے جہاد وقتال سے انکار پر حضرت موسیٰؑ کے رنج وغم کا یہ عالم ہے کہ وہ بیزاری کا اس بے چارگی کے ساتھ اظہار فرما رہے ہیں۔ یہ ایک طرف قوم کی بدبختی اور بدنصیبی کی علامت ہے تو دوسری طرت حضرت موسیٰؑ کی حمیت وغیرتِ دینی کی نشانی ہے۔ اسی حمیت دینی کے جذبے سے غضب ناک ہوکر حضرت یونس علیہ السلام یہ خطا کر بیٹھے تھے کہ بغیر اللہ کی اجازت کے اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہاں اللہ کا جلیل القدر رسول دعا کر رہا ہے کہ اے اللہ! میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے اجازت دے دے کہ میں ان سے علیحدہ ہو جاؤں! لیکن اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ نہیں' آپ کو ان کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ یہ صحرائے تیہہ میں بھٹکیں گے اور آپ ساتھ رہیں گے۔

بنی اسرائیل کی ڈھٹائی اور نافرمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخ کا عمل وہیں رک گیا۔ مشیتِ خداوندی میں ارضِ مقدس ان کو دی جانی طے کی جا چکی تھی' لیکن انہوں نے جہاد وقتال سے انکار کیا تو اس کی ان کو یہ سزا ملی:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶﴾ (المائدۃ)

''(اللہ نے) فرمایا: اچھا تو یہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے' یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے۔ ان نافرمانوں پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔''

چنانچہ پوری قوم چالیس سال تک صحرائے سینا میں ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اسی صحرا نوردی میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا انتقال ہوگیا۔ اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبر جو بیک وقت موجود تھے (ایک اکیلا دو گیارہ) وہ قوم کے کورے جواب سے آزردہ اور دل گرفتہ ہوگئے اور تاریخ کا دھارا چالیس سال کے لیے رک گیا۔ اس طرح یہ ثابت ہوگیا کہ اقامت دین کا کام اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ جماعت وتنظیم موجود نہ ہو۔ اگر یہ کام انفرادی طور پر ممکن ہوتا تو ان دو جلیل القدر انبیاء کے ہاتھوں ضرور انجام پاتا۔

## اقامت دین اور صحابہؓ کی جماعت

آ گے چلیے اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجیے۔ اس عالمِ اسباب اور عالمِ علت ومعلول میں جزیرہ نمائے عرب کے اندر اللہ کا دین بتمام وکمال قائم ونافذ ہوا ہے تو آنحضورﷺ کے شانہ بشانہ اُن صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جانفشانیوں‘ سرفروشیوں‘ قربانیوں‘ جدوجہد اور جہاد وقتال کے نتیجے میں ہوا ہے جو اللہ پر‘ اُس کے رسولﷺ پر اور یومِ آخرت پر پختہ ایمان وایقان رکھتے تھے اور جو اس کسوٹی پر کھرے ثابت ہوئے تھے جو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں بیان فرمائی ہے:

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ﴾

’’اور تاکہ اللہ دیکھ لے کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے۔‘‘

آنحضورﷺ پر ایمان لانے والے جان نثاروں کی جو جماعت اور تنظیم قائم ہوئی تھی اس کی مدح اللہ تعالیٰ سورۃ الفتح میں ان الفاظِ مبارکہ سے فرماتا ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾﴾

’’محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں‘ اور جو لوگ اُنؐ کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع وسجود اور اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجدوں کے اثرات اور نشانات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں‘ اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی

ہے جس نے پہلے کونپل نکالی' پھر اس کو تقویت دی' پھر وہ گدرائی' پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی' کاشت کرنے والوں کو وہ بھلی لگتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ ان میں سے ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں سے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس جماعت نے دعوت الی اللہ' اعلائے کلمۃ اللہ' شہادت علی الناس اور اظہارِ دین کے لیے شدائد و مصائب' کشمکش و تصادم' سعی و محنت اور جہاد و قتال میں جان نثاری اور صبر و مصابرت اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کی ہیں جن کی نظیر تاریخِ انسانی آج تک پیش نہیں کرسکی اور نہ آئندہ پیش کرسکے گی۔ وہ خاک و خون میں لوٹے ہیں اور انہوں نے نقدِ جاں کا نذرانہ اللہ کی راہ میں پیش کیا ہے تو اللہ کا دین غالب اور قائم و نافذ ہوا ہے۔ ایسے ہی جان نثاروں کے لیے یہ نوید جانفزا دی گئی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصّف)

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

غور کیجیے کہ بالفرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی اللہ پر لبیک نہ کہتے' آپؐ کے دست مبارک پر اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جان نثاری اور سرفروشی کی بیعت نہ کرتے' استقامت اور صبر و مصابرت کا عملی مظاہرہ نہ کرتے' سمع و طاعت کو اپنا شعار نہ بناتے اور ہجرت و جہاد کو اپنے لیے دنیا و آخرت کی سعادت اور فوز و فلاح ہونے کا یقین نہ رکھتے تو کیا اس عالمِ اسباب میں وہ نتائج برآمد ہوتے جو عہدِ نبوت اور عہدِ خلافت راشدہ میں نکلے اور اس دنیا میں وہ صالح معاشرہ وجود میں آتا جو ہر لحاظ سے نوعِ انسانی کے لیے جنت ارضی ثابت ہوا؟

## جماعت کا حکم

مذکورہ بالا دو نظیروں کے بعد مزید کسی عقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم ہوا

کہ عبادتِ ربّ، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے التزامِ جماعت ناگزیر اور لابُدّ منہ ہے۔ لیکن اس پر مستزاد رسول اللہ ﷺ نے التزامِ جماعت کا حکم بھی فرمایا ہے۔ حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ :بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (۱)

''(مسلمانو!) میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: (۱) جماعت کا (۲) سننے کا (۳) ماننے کا (۴) ہجرت کا (۵) اللہ کے راستے میں جہاد کا''۔

چنانچہ یہ سنت رسول بھی ہے اور اس کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ یہ تقرب بالفرائض کا لازمی حصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ اُمت کو ان پانچ باتوں کا حکم دے رہے ہیں، لیکن ہمارا تصور دین اتنا بدل گیا ہے کہ یہ پانچ باتیں لاکھ میں سے ایک کو بھی یاد نہیں ہوں گی، بلکہ یہ اکثر علماء کو بھی یاد نہیں ہیں۔ مجھے اس حدیث کی سند درکار تھی تو میں نے ایک بہت بڑے عالمِ دین سے رجوع کیا اور ان کو یہ حدیث سنا کر سند معلوم کرنی چاہی۔ فرمانے لگے: ''الفاظ غیر مانوس سے ہیں'' حالانکہ یہ روایت مشکوٰۃ میں موجود ہے اور مشکوٰۃ تو گویا علمِ حدیث کا قاعدہ ہے جو ہر دارالعلوم کے نصاب میں لازماً شامل ہوتی ہے۔ یہ حدیث مشکوٰۃ میں مسند احمد اور ترمذی کے حوالے سے روایت کی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلی بات یہ فرمائی: ((بِالْجَمَاعَۃِ)) ''جماعت کی زندگی اختیار کرو''۔ اور جماعت کیسی؟ چار آنے کی ممبری والی جماعت نہیں۔ کوئی محض جزوی سے تعاون کی طلب گار جماعت نہیں۔ بلکہ جو جماعتی زندگی اختیار کر لینے کا حکم دیا جا رہا ہے اس میں دو باتیں لازمی ہیں: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ)) جس میں ڈسپلن ہو، نظم ہو کہ ''سنو اور اطاعت کرو''۔

---

(۱) مسند احمد، مسند الشامیین، ح۱۶۷۱۸ و ۱۷۳۴۴ و باقی مسند الانصار، ح ۲۲۴۰۳۔ وسنن الترمذی، ابواب الامثال عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام الصدقۃ۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء، الفصل الثانی۔

## ہجرت اور جہاد کا وسیع تر مفہوم

اس جماعت کا کام کیا ہوگا؟ جماعت مقصود بالذات تو نہیں ہے۔ اس جماعت کو جو کام کرنا ہے اس کے دو حصے ہیں۔ ایک ((وَالْهِجْرَةِ)) اور دوسرا ((وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ۔ ہجرت کا وسیع تر مفہوم ہے ہر اُس چیز سے کٹ جاؤ جس سے کٹنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ہر وہ کام کرو جس کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا:

اَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟

''کون سی ہجرت افضل ہے اے اللہ کے رسول؟''

آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ)) (۱)

''یہ کہ تو ہر اُس چیز کو چھوڑ دے جو تیرے ربّ عزیز وجلیل کو پسند نہیں''۔

یہ ہے ہجرت ـــــ اور جہاد کا نقطۂ آغاز کون سا ہے!

یاد کیجیے کہ میں نے اوّلین، مقدم ترین فرض بیان کیا تھا ''عبادتِ ربّ''۔ یہ ہے وہ تنا جس سے فرائض کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اس فرض کی بجا آوری کے لیے سب سے پہلے اپنے نفس سے کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ ایک حدیث میں نفس کے خلاف جہاد کو ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى))(۲)

''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو''۔

دراصل سب فرائضِ دینی ایک وحدت ہیں۔ اس شجرۂ طیّبہ کی جڑ ہے ایمان اور اس کا تنا ہے عبادتِ ربّ۔ بات ایک ہی ہے خواہ کسی حوالے سے سمجھ لی جائے۔ اتباعِ

(۱) سنن النسائی، کتاب البیعة، باب هجرة البادی۔

(۲) سلسلة الاحادیث الصحیحة للالبانی: ۱۴۹۶۔ رواه ابو نعیم فی "الحلیة" (۲۴۹/۲) والدیلمی (۱۲۸/۱/۱)۔ کنز العمال ۲۶۹/۴۔

سنت کے حوالے سے سمجھ لی جائے' یا تقرب الی اللہ کے حوالے سے' یا اس حوالے سے سمجھ لی جائے کہ از روئے قرآن حکیم دینی فرائض کا تصور کیا ہے!

## اہل پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

اس پر مستزاد ہم پاکستانیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اسلام ہمارا دین ہی نہیں ہے دُنیا بھی ہے۔ ہم تو ''ناچار مسلمان شو'' پر مجبور بھی ہیں۔ اچھی طرح جان لیجیے کہ ہمارا دنیا میں ''دین'' کے قیام و نفاذ کے بغیر کوئی ٹھکانہ نہیں۔ دین کے نفاذ سے اعراض و اغماض کی سزا کے طور پر ہمارا ملک دولخت ہوا۔ اب پھر دین سے بے اعتنائی' لاتعلقی بلکہ اس کے خلاف افعال و اعمال کی پاداش میں موجودہ پاکستان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوسکتا ہے۔ اس کے خلاف عالمی سطح پر سازشیں ہو رہی ہیں۔ بہرحال ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں!

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے اولیاء کے ضمن میں معاملہ بڑا مختلف ہے۔ اگر یہاں صحیح معنی میں چند لوگ گفتار و کردار کے لحاظ سے اللہ کے ولی بن جائیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کی وجہ سے اس ملک کی کشتی بھنور سے نکل سکے اور بیڑا پار لگ سکے۔ وہ بات غلط نہیں ہے جو فارسی کے اس شعر میں کہی گئی ہے۔

تا دلِ صاحب دلے نامد بہ درد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد!

اللہ تعالیٰ کو اپنے اولیاء اتنے محبوب ہوتے ہیں کہ بعض اوقات کسی ایک ولی کا دکھ بھی اسے گوارا نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ اس کا اتنا کچھ تعلق ہوتا ہے کہ پوری پوری قوموں کے فیصلے اس کے حوالے سے ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں اقامت دین کی جدوجہد کا راستہ یہی ہے کہ ایک تنظیم اور جماعت ہو جو خود بھی عبادت ربّ کی راہ پر گامزن ہونے کی مخلصانہ کوشش کرے اور لوگوں کو بھی اس کی طرف دعوت دے۔ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔ انفرادی طور پر ایمان کی اساسات جیسے جیسے محکم ہوں گی اور سیرت و کردار کی تعمیر شروع ہوگی' اخلاق بدلیں گے' معاملات درست ہوں گے' گھر کے ماحول

میں صبغۃ اللہ غالب ہوگا اور جیسے جیسے خلقِ خدا کو دعوتِ عبادتِ ربّ دی جائے گی ویسے ویسے یہ تبدیلی اور دعوت معاشرے پر اثر انداز ہوتی چلی جائے گی اور اس طرح ان شاءاللہ اصلاحِ معاشرہ کا یہ عمل اسلام کو اس ملک میں مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے میں ممد ومعاون ہوگا۔

## اہل ایمان کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل

آغازِ خطاب میں سورۂ آل عمران کی تین آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) کی تلاوت کی گئی تھی۔ ان آیات میں دعوتِ عبادتِ ربّ ایک دوسرے اسلوب سے دی گئی ہے اور مسلمانوں کو ان کے فرائض کی بجاآوری کے ضمن میں ایک سہ نکاتی لائحہ عمل دیا گیا ہے۔

i) تقویٰ کی تاکید: پہلی آیت میں ایک مسلمان کے انفرادی فرائض کو emphasize کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ‘فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾

’’اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کا تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے‘‘۔

ہمارے دین کی اصطلاحات میں ’’تقویٰ‘‘ انتہائی جامع اصطلاح ہے۔ اجمالاً یہ سمجھ لیجیے کہ تقویٰ عبادتِ ربّ کے اس طرزِ عمل کی تشریح ہے کہ ایک بندۂ مؤمن اللہ کی ناراضگی اور اس کی سزا کے خوف اور اس کے انعام‘ نگاہِ کرم اور نظرِ ترحم کے شوق سے نافرمانی و معصیت کے ہر عمل سے بچتا ہوا دین کے تقاضوں اور مطالبوں کو ادا کرنے کی فکر کرے۔

آیت کا اگلا حصہ اسی تقویٰ کی زندگی کی شرح ہے:

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾

’’اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم اللہ کے فرمانبردار ہو‘‘۔

یعنی زندگی کا کوئی لمحہ بھی شعوری طور پر اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی میں نہ گزرے‘

مبادا اسی حال میں تم کو موت آ دبوچے کہ تم معصیت کا ارتکاب کر رہے ہو۔ لہٰذا دعوتِ بندگیٔ ربّ کا پہلا نکتہ ہوگا اسی تقویٰ کی دعوت' تطہیر افکار و اعمال کی دعوت' اخلاق و معاملات کی درستگی کی دعوت' تمام معاصی سے اجتناب کی دعوت اور مسلمان کی حیثیت سے جینے اور مرنے کی دعوت۔

ii) اعتصام بحبل اللہ: اگلی آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ افرادِ اُمت کو باہم جوڑنے اور انہیں ایک اُمت بنانے والی شے اور ان کے مابین ذہنی وفکری ہم آہنگی پیدا کرنے والی شے کون سی ہے! فرمایا:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠﴾

''اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو اور تفرقے میں نہ پڑو''۔

اللہ کی رسّی سے مراد ''قرآن مجید'' ہے[1]۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں قرآن مجید کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) ''یہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ چنانچہ یہ کتابِ الٰہی وحدتِ اُمت کی اوّلین اور مضبوط ترین بنیاد ہے۔ یہی اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى ہے اور اسی کا وصف لَانْفِصَامَ لَهَا ہے۔ اسی کو مضبوطی سے تھامنے اور تفرقے سے بچنے کا آیت کے اس حصے میں حکم دیا گیا ہے۔

اُمت کے اتحاد اور وحدت کو پارہ پارہ کرنے والا عمل تفرقہ ہے۔ اختلاف اور تفرقے میں بڑا فرق ہے۔ اختلاف دین کے دائرے میں رہے تو کوئی مضائقہ نہیں' لیکن رائے' قیاس اور تعبیر کے اختلافات کی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ باقاعدہ فرقے بنا لینا دینی نقطۂ نظر سے بالکل غلط اور تباہ کن ہے۔ غور کیجیے کہ ان اختلافات کی نوعیت ہے کیا؟ کوئی رفع یدین کرنے کا قائل ہے کوئی نہیں کرتا' کوئی آمین زور سے کہتا ہے کوئی آہستہ' کوئی امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھنے کا قائل ہے کوئی نہیں۔ یہ فروعی اختلافات

(۱) اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کی معرکۃ الآراء تالیف ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا مطالعہ ان شاء اللہ مفید مطلب ہوگا۔ (مرتب)

ہیں اوران سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔ان تمام مسالک کے حق میں احادیث بھی موجود ہیں اور آثارِ صحابہؓ بھی ۔لیکن اب ان مسائل کی تائید یا تردید پر تمام توجہات مرکوز کرنا آخر کون سی دین کی خدمت ہے؟ جبکہ حال یہ ہے کہ ہماری نوے فیصد آبادی دین سے دُور جا چکی ہے اور سرے سے نماز کی ادائیگی ہی سے غافل ہے۔ یہ تفرقہ بازی اُمت کے لیے کتنی ہلاکت خیز ثابت ہو رہی ہے اس کا اندازہ ہر حساس شخص خود کر سکتا ہے۔اس تفرقہ بازی کا علاج بھی اللہ تعالیٰ نے ''اعتصام بالقرآن'' قرار دیا ہے کہ ''اللہ کی رسّی (یعنی قرآن حکیم) کو مضبوطی سے تھامو اور تفرقہ میں مت پڑو!''

اس آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت اور احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ قرآن مجید اور ایمان و اسلام نے اُن قبیلوں کو باہمی شیر وشکر اور بھائی بھائی بنا دیا جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے' اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاکت اور تباہی سے بچا لیا۔فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ﴾

''اور (اے مسلمانو!) یاد کرو اپنے اوپر اللہ کا یہ احسان جب تم آپس میں دشمن تھے' پھر اُس نے تمہارے دلوں میں باہم محبت پیدا کر دی' پس اللہ کے انعام و اکرام سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے تک جا پہنچے تھے' پس اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا''۔

قرآن حکیم کا ایک عظیم ترین اعجاز یہ بھی ہے کہ اس کے وقتی احکام اور تبصروں میں ابد الآباد تک کے لیے ہدایات موجود ہوتی ہیں۔

غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظِ مبارکہ ہمارے ہی لیے نازل کیے گئے ہیں اور ان میں ہمارے لیے پوری رہنمائی موجود ہے۔ہم فی الواقع تفرقے اور انتشار کے تباہ کن اور ہلاکت خیز گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں اور تباہی و بربادی کے اس گڑھے میں گرا ہی چاہتے ہیں۔ہم اس سے بچائے جا سکتے ہیں اور ہم پر اللہ کی اس

نعمت کا فیضان ہوسکتا ہے کہ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے سے الفت' مودّت اور اخوت پیدا ہو جائے۔لیکن اس کی شرائط ہم کو پوری کرنی ہوں گی اور وہ یہ کہ ہم واقعی بندۂ ربّ بنیں۔تقویٰ' اسلام اور اعتصام بالقرآن کو اپنا لائحہ عمل اور مقصود ومطلوب بنا لیں اور آخرت میں اللہ کی رضا کا حصول ہمارا نصب العین بن جائے۔ہم تفرقے سے بچیں اور متقی مسلمانوں کی طرح انفرادی واجتماعی زندگی بسر کرنے کی اخلاص کے ساتھ پوری کوشش کریں۔اس آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴿۱۰۳﴾﴾

''اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں واضح کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو۔''

ان نشانیوں سے تمہیں ہدایت کا سیدھا راستہ نظر آ جائے اور تم اس پر گامزن ہو جاؤ۔ ان دونوں آیتوں کے بین السطور میں یہ ہدایت موجود ہے کہ اصلاحِ حال کے لیے اس ملک میں وسیع پیمانے پر عبادتِ ربّ' تجدید ایمان' تقویٰ و اسلام' توبہ و انابت اور اصلاحِ افکار واعمال کی ایک زوردار دعوت اٹھے' جس کے داعی خود بھی حقیقی طور پر بندۂ ربّ بننے کی سعی وکوشش کریں' اپنے غلط وغیر اسلامی ماحول سے کشمکش کریں اور لوگوں کو بھی دعوت دیں کہ اللہ کے بندو! ہوش میں آؤ' کہاں جارہے ہو؟ تم مدہوش ہو' خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔تمہیں اپنے ذاتی مفادات کی فکر ہے' فروعی اور جزوی مسائل میں الجھ کر تم ایک دوسرے سے دست بگریباں ہو' جبکہ حال یہ ہے کہ وہ پورا جہاز ہچکولے کھا رہا ہے جس میں ہم سب سوار ہیں۔تم کو اس جہاز کی سلامتی کی فکر کرنی چاہیے۔یہ ہیں ان لوگوں کے کرنے کے کام جن کو اپنے ان دینی فرائض کی ادائیگی کا احساس ہو جائے۔

iii) لزومِ جماعت کی تاکید اور اس کے لیے سہ نکاتی پروگرام: اگلی آیت میں ایسی داعی جماعت کے لزوم کی تاکید فرما کر اس جماعت کے لیے سہ نکاتی پروگرام پیش فرمادیا گیا ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

''اورتم میں ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہیے جولوگوں کو خیر اور نیکی کی طرف بلانے والی ہو' جو بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے' اور یہی لوگ (جو جماعتی طور پر دعوت کا یہ کام کریں گے) فلاح پائیں گے۔''

غور کیجیے' اس آیت مبارکہ میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت کا وجود ضروری ہے جس کا مقصدِ وجود صرف دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ اس دنیا میں اس جماعت کو نہ تو کسی بدلے اور اجر کی خواہش ہو اور نہ ہی دنیا کا کوئی مفاد اور کوئی غرض اس دعوتی کام سے وابستہ ہو۔ اس جماعت کے وابستگان صرف یہی تین کام کریں جو اس آیت مبارکہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے سوا کسی چوتھے کام کے خیال کو وہ اپنے ذہن میں گزرنے بھی نہ دیں۔ وہ علیٰ رؤس الاشہاد اعلان کر دیں کہ ہمارا انتخابی سیاست سے کوئی تعلق و سروکار نہیں ہوگا۔ جو لوگ یک سو ہو کر ہمہ تن دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سہ نکاتی پروگرام میں مصروف ہو جائیں گے ان ہی کے لیے یہ بشارت اور نوید جانفزا ہے کہ یہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔

## توبہ کی منادی

آج ہمارا معاشرہ اس امر کا شدید محتاج ہے کہ اسے جھنجوڑا جائے' اس میں آخرت کا خوف پیدا کیا جائے' اس کو پکارا جائے کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶) ''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو (جہنم کی) آگ سے''۔ اس میں توبہ کی ایک عمومی منادی کی جائے کہ اللہ کے بندو! باز آؤ معصیت اور نافرمانیوں سے' باز آؤ حرام خوریوں سے' باز آؤ ہیرا پھیریوں سے' باز آؤ رشوت دینے اور رشوت خوری سے' باز آؤ ملاوٹ سے اور ذخیرہ اندوزی سے' باز آؤ سودی کاروبار سے' کم تولنے اور کم ناپنے سے! اپنی تمام بداعمالیوں اور بے عملیوں سے توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کرو۔ اپنے ربّ کے ساتھ از سرِ نو عہد

کرو کہ اے اللہ! ہم تیرے مخلص بندے بن کر خود بھی دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں گے اور تیرے دین کے داعی بن کر معاشرے کو بھی عبادتِ ربّ اور توبہ وانابت الی اللہ کی دعوت دیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ.....﴾ (التحریم:۸)

''اے ایمان والو! اللہ کے حضور توبہ کرو، خالص توبہ۔ بعید نہیں کہ (اس توبہ کی بدولت) اللہ تم سے تمہاری برائیاں دُور فرما دے.....''

توبہ کا یہ عمل اگر عوام وخواص میں ایک ہمہ گیر اور اجتماعی سطح پر نہیں ہوتا تو جان لیجیے کہ اس دنیا میں بھی عذابِ الٰہی سے سابقہ پیش آ کر رہے گا اور آخرت میں بھی۔ اجتماعی توبہ سے عذابِ خداوندی ٹل جاتا ہے۔ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر عذابِ الٰہی کے آثار شروع ہو گئے تھے، لیکن یہ عذاب ان کی اجتماعی توبہ سے ٹل گیا تھا۔

آج داخلی اور خارجی طور پر ہم جن حالات سے دوچار ہیں یہ دراصل تنبیہہ خداوندی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس سے غافل ہیں۔ اگر یہ تغافل اسی طرح جاری رہا تو ہم پر عذابِ الٰہی کا کوڑا برس سکتا ہے۔ اس وقت ہم مخلصانہ اجتماعی توبہ کے محتاج ہیں، اور یہی عمل ہم کو اللہ کی پکڑ سے بچا سکتا ہے۔ بقول جگر مرادآبادی:

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی!

اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جب کسی اُمت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس بگڑے ہوئے معاشرے میں تین طرح کے طبقات پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جو بگاڑ میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بگاڑ سے خود تو بچے ہوتے ہیں لیکن دوسروں کو روکتے نہیں، ان کو نصیحت کرنے میں تغافل شعاری اختیار کرتے ہیں۔ جبکہ تیسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو خود بھی بگاڑ سے مجتنب رہتا ہے

اور لوگوں کو روکنے کے لیے مواعظ و نصائح کرتا ہے اور اصلاحِ احوال کی سعی و کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ یہ تیسرا طبقہ عذابِ الٰہی سے بچا لیا جاتا ہے' اور اگر دنیا میں وہ کہیں اس کی لپیٹ میں بھی آ جائے تو آخرت میں وہ فوز و فلاح سے سرفراز کیا جاتا ہے اور آخرت میں کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔

## جدا ہو دیں سیاست سے تو.....

میں نے عرض کیا تھا کہ وہ جماعت یا تنظیم جو دعوت الی الخیر کے لیے وجود میں آئے اسے انتخابی سیاست سے بالکلیہ علیحدہ رہنا چاہیے۔ اس کی حکمت بھی سمجھ لیجیے۔ انتخابی سیاست کا میدان حصولِ اقتدار اور سیادت و قیادت کی جنگ کا میدان ہے۔ یہ تحزب' تعصّب اور حریفانہ طرزِ عمل کی راہ ہے۔ یہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا راستہ ہے۔ اس راہ میں دلوں میں کدورتیں اور تلخیاں بڑھتی ہیں' مخالفتیں اور دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس راہ میں ''ووٹروں'' کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے' اس لیے ان کے غلط اور غیر اسلامی افکار و اعمال اور معاملات پر مداہنت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس میدان میں ہر پارٹی دوسری پارٹیوں اور اُن کے قائدین کو طعن و تشنیع اور استہزاء و تمسخر کا ہدف بناتی ہے جس کے باعث آپس میں نفرتیں بڑھتی ہیں۔ جبکہ دعوت الی الخیر اصلاح اور نصح و خیر خواہی کی راہ ہے' دلوں کو جیتنے اور باہمی الفت و مودّت اور اخوت پیدا کرنے کی راہ ہے۔

یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ دین میں سیاست کوئی شجرِ ممنوعہ ہے یا ہمارے دین کے دائرے سے باہر کی کوئی چیز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دین میں سیاست بھی ہے' حکومت کے معاملات بھی ہیں۔ ہمارا دین انسانی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے' چاہے وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

''اے اہل ایمان! اسلام (نظامِ فرمانبرداری) میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔''

''سیاست'' کا لفظ بڑے قابل احترام انداز میں حدیث شریف میں آیا ہے۔ نبی

اکرم ﷺ نے فرمایا:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَاءِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ)) (۱)

''بنی اسرائیل کا معاملہ یہ تھا کہ اُن کی سیاست انبیاء کے ہاتھ میں رہتی تھی''۔

علامہ اقبال نے دین اور سیاست کا تعلق اس طرح بیان کیا ہے: ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

چنانچہ دعوت الی الخیر میں سیاسی نظام کی تبدیلی بھی شامل ہے۔ یہ اظہار دین الحق علی الدین کلہ کی اعلیٰ و ارفع منزل ہے۔ یہ دنیا میں عبادتِ ربّ کا مظہرِ اتم ہے۔ لیکن انتخابی سیاست' جس کی بنیاد حریفانہ انداز سے حصولِ اقتدار ہوتی ہے' ہمیں اس طور کی سیاست میں کسی حال میں شریک نہیں ہونا۔ ہماری منزل اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دین حق ہے' اور میرے نزدیک یہ خواب اُمت مسلمہ میں تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد کی عمومی تحریک کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اسلامی انقلاب کا پہلا اور مقدم مرحلہ تطہیر افکار اور تعمیر سیرت و کردار ہے جس کی اصل اساس ایمان ہے اور اس ایمان و یقین کا منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔

## انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کا قیام

۱۹۶۷ء میں جب میں شعوری طور پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایک جماعت ناگزیر ہے تو یہ بھی عزم کر لیا تھا کہ اس مقصد کے لیے جماعت بنانے کی کوشش کروں گا۔ اُس وقت میں نے دعوت رجوع الی القرآن کا کام تنہا شروع کیا تھا۔ اللہ کے فضل سے ۱۹۷۲ء میں وہ پہلا مرحلہ آ گیا کہ دعوت رجوع الی القرآن کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ اس موقع پر میں نے ''میثاق'' میں لکھا تھا کہ یہ وہ جماعت نہیں ہے جو میری اصل منزل ہے۔ یہ عبوری دَور اور ابتدائی مرحلے کا معاملہ ہے۔

اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں میری دعوت پر تنظیم اسلامی قائم ہوئی۔ اس تنظیم کی

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلفاء الاوّل فالاوّل۔

تشکیل میں ہم نے دستوری، قانونی اور جمہوری اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا، جو ہمارے نزدیک مغرب سے درآمد ہوئے ہیں، بلکہ ان کو بالکل چھوڑ کر ہم نے اس ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے نظامِ بیعت کے اصول اور طریقے کو اختیار کیا، جو قرآن مجید اور سنتِ رسول کی اصطلاح ہے۔ ہمارے اسلاف کا طریقہ یہی رہا ہے اور ہماری ماضی کی تمام دینی تحریکوں میں بھی یہی نظام اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اعمال کے لیے بھی بیعت ہوتی ہے، جو ''بیعتِ ارشاد'' کہلاتی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جو بھی تحریکیں اٹھی ہیں وہ بھی بیعت کے نظام پر اٹھی ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں اصل طریق محمدی اور سلوک محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا جب سید احمد بریلویؒ نے احیاء کیا تھا تو وہ بیعت ہی کی بنیاد پر کیا تھا۔ ہم کسی جزو میں بھی مغرب کی تقلید نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اُسی طریقہ کو ترجیح دیتے ہیں اور اُسی کو افضل اور باعثِ خیر سمجھتے ہیں جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہو اور جس پر ہمارے سلف صالحین گامزن رہے ہوں۔ اسی لیے ہم نے باہر سے درآمد شدہ جمہوری و دستوری طریقۂ تنظیم اختیار نہیں کیا، بلکہ طریقۂ بیعت اختیار کیا ہے اور اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی قرآنی ہدایت کو اپنا رہنما اصول بنایا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی فرمانِ نبویؐ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ کی تعمیل ہے اور سنت سے ماخوذ طریق تنظیم کو اختیار کرنے ہی میں ہماری فوز وفلاح ہے۔

میں نے اپنی استعداد و استطاعت کی حد تک آپ کو آپ کی دینی و ملی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ اب یہ کام آپ کا ہے کہ آپ سوچیں، غور کریں، مطالعہ کریں۔ کوئی اشکال ہو، کوئی الجھن ہو، کوئی وضاحت مطلوب ہو تو ہم حاضر ہیں۔ کوئی بات غلط معلوم ہوئی ہو تو اس کی غلطی ہم پر واضح کریں۔ ان سب کے لیے ہمارا سینہ کشادہ ہے۔ لیکن اگر معاملہ یہ ہو کہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ حق یہی ہے، قرآن مجید کے حوالے سے بھی صحیح بات یہی ہے، سنتِ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بھی صحیح بات یہی ہے، سلوک وطریقت کے حوالے سے بھی صحیح بات یہی ہے، تقرب بالفرائض کے حوالے سے بھی صحیح بات یہی ہے، از روئے عقل ومنطق بھی صحیح بات یہی ہے، تو

پھر اس سے دُور رہنا' اس سے کنارہ کش رہنا' اس سے دامن بچا بچا کر نکلنا میرے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ میں آپ کی نصح و خیر خواہی کے پیش نظر آپ کو خبردار (warn) کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد آپ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح رخ پر سوچنے اور غور و فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور جس فیصلے تک آپ پہنچیں اس پر عزم بالجزم کے ساتھ پیش رفت کے لیے آپ کی نصرت فرمائے! اللہ تعالیٰ اسے آپ کے حق میں بھی مبارک کرے اور میرے حق میں بھی بابرکت بنائے۔ آمین!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات